میٹروپولیٹن شہر کی سماجیات: آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے مسائل کی پیشکش کا سماجی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اُردو)

مقالہ نگار:

تحسین اختر

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۲ء

میٹروپولیٹن شہر کی سماجیات: آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے مسائل کی پیشکش کا سماجی مطالعہ

مقالہ نگار:

تحسین اختر

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان وادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۲ء

©

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **میٹروپولیٹن شہر کی سماجیات: آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے مسائل کی پیشکش کا سماجی مطالعہ**

پیش کار: تحسین اختر رجسٹریشن نمبر: 1738/M/U/S19

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان وادب

ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر عامر اعجاز ____________________

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ: ____________

اقرارنامہ

میں، تحسین اختر حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل اُردو اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

تحسین اختر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

مقالہ اور دفاع کی منظوری کا فارم IV

اقرار نامہ V

فہرست ابواب VI

Abstract VIII

اظہارِ تشکر IX

باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث ۰۱

الف۔ تمہید ۰۱

۱۔ موضوع کا تعارف ۰۱

۲۔ بیان مسئلہ ۰۱

۳۔ مقاصدِ تحقیق ۰۲

۴۔ تحقیقی سوالات ۰۲

۵۔ نظری دائرہ کار ۰۲

۶۔ تحقیقی طریقہ کار ۰۳

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق ۰۳

۸۔ تحدید ۰۴

۹۔ پس منظری مطالعہ ۰۴

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت ۰۴

ب۔ بنیادی مباحث ۰۵

۱۔ میٹروپولیٹن شہر کی سماجیات ۰۵

۲۔ آصف فرخی تعارف و تصانیف ۱۰

ج۔ آصف فرخی کی افسانہ نگاری ۱۷
د۔ اردو افسانے کی روایت اور کراچی ۲۴
ا۔ کراچی اور کراچی سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار ۳۴
حوالہ جات ۴۱

باب دوم: آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے انفرادی مسائل کا تجزیہ ۴۳
الف۔ آصف فرخی کے منتخب افسانوں میں فرد کی نفسیات کا کراچی کے مسائل کے تناظر میں تجزیہ ۴۳
ب۔ آصف فرخی کے منتخب افسانوں میں فرد کے سماجی مسائل کی پیش کش کا تجزیہ ۴۹
ج۔ آصف فرخی کے منتخب افسانوں میں معاشی مسائل کا تجزیہ ۵۳
حوالہ جات ۵۹

باب سوم: آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے اجتماعی مسائل کا تجزیہ ۶۰
الف۔ آصف فرخی کے منتخب افسانوں میں کراچی کے سیاسی و انتظامی مسائل کا تجزیہ ۶۰
ب۔ آصف فرخی کے منتخب افسانوں میں ماحولیاتی مسائل کا تجزیہ ۶۷
ج۔ آصف فرخی کے منتخب افسانوں میں امن و امان کے مسائل کا تجزیہ ۷۲
حوالہ جات ۸۱

باب چہارم: مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات ۸۲
الف۔ مجموعی جائزہ ۸۲
ب۔ تحقیقی نتائج ۹۳
ج۔ سفارشات ۹۳
کتابیات ۹۵

ABSTRACT

Asif Farrukhi embeds contemporary societal concerns in his Fiction. Being a karachiite he addresses individual as well as collective issues of his city. He views Karachi in a different light by centralising, psychological, socio-economical and emotion problems of individual in his writings. The trials and turmoils caused by these crisis are interwoven in his fictional fabrics. His writing also sheds light on political, administrative, and environmental as well as law and order issues that increases worth of farrukhi's work. In this research the researcher has used Dr. Jameel Akhtar Mohibi "Falsafa-e- Wajoodiat aur Jadeed Urdu Afsana" as a theoretical frame work to analyze Farrukhi's works. This research paper consists of four chapters. The first chapter covers the research topic and basic discussions, while in the second chapter, the analysis of the individual problem of Karachi has been presented in the context of Asif Farrukhi's fiction. The third chapter of the research paper contains the analysis of collective problems of Karachi and finally, the overall review of this research paper is presented. This thesis also tries to suggest possible solutions faced by karachiites.

اظہارِ تشکر

میں پاک پروردگار کی شکر گزار ہوں جو بے حد مہربان اور ہمیشہ اپنا رحم کرنے والا ہے اس سفر میں بھی اسی ذات نے مجھے مقالہ کی تکمیل کی منزل تک پہنچایا۔ میں اپنے والدین کی بے حد شکر گزار ہوں جن کی محنت، توجہ اور محبت سے میرا تعلیمی سفر جاری ہے۔ میں اپنے نگران مقالہ ڈاکٹر عنبرین شاکر کی ممنون ہوں جنھوں نے اس تحقیقی سفر میں میری بھرپور رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ اپنے شعبے کے اساتذہ ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر رخشندہ مراد اور باقی تمام اساتذہ کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے ایم فل کے اس سفر میں میری راہنمائی کی۔ میں ڈاکٹر بلال سہیل کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے مقالے کے مواد کے حوالے سے میری مکمل رہنمائی کی۔ میں اپنے دوستوں اور گھر والوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کے تعاون کے بغیر مقالہ کی بروقت تکمیل ممکن نہ تھی۔

ایم فل سکالر

تحسین اختر

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

۱۔ موضوع کا تعارف

ڈاکٹر آصف فرخی موجودہ دور کے بہترین ادیب، افسانہ نگار، مترجم، منتظم، نقاد اور "دنیازاد" رسالہ کے مدیر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آصف فرخی نے افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۸۲ء میں کیا۔ آپ کے افسانوی مجموعوں میں آتش فشاں پر کھلے گلاب، اسمِ اعظم کی تلاش، چیزیں اور لوگ، شہر بیتی، شہر ماجرا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا، ایک آدمی کی کمی اور میرے دن گزر رہے ہیں شامل ہیں۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد میں موجود فرد کے احساس تنہائی، وحشت زدہ جذبات، اذیت و بے بسی جیسی شدید کیفیات کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے آبائی شہر کراچی کے لیے ان کی دلی وابستگی اور کراچی شہر کو پچھلی کچھ دہائیوں سے درپیش صورتحال کو انتہائی گہرائی سے مشاہدہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ آصف فرخی اپنے افسانوں میں کراچی شہر کو درپیش سماجی، ماحولیاتی اور دہشتگردی جیسے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

زیرِ نظر مقالے کا موضوع "آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے مسائل کی پیشکش کا سماجی تجزیہ" ہے۔ آصف فرخی کے افسانوی مجموعوں میں پیش کیے گئے کراچی کے انفرادی و اجتماعی مسائل کا تجزیاتی مطالعہ ان کے افسانوں کے تناظر میں کرنا اس مقالے کا موضوع ہے اس مقالے کے ذریعے یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ آصف فرخی اپنے عہد کے آشوب کو اپنے افسانوں کا موضوع بنانے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

۲۔ بیان مسئلہ

ادیب اپنے عہد کا نباض اور معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ ادیب اپنے گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات سے متاثر ہوتا ہے اور انہیں حالات و واقعات اور گردوپیش کی صورتحال کو اپنی تحریر کا حصہ بنا دیتا ہے۔ آصف فرخی کا تعلق کراچی سے ہے۔ آپ نے کراچی کی صورتحال کو بہت قریب سے دیکھا، اس کا مشاہدہ کیا اور اسے

اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔ آصف فرخی اپنے افسانوں میں کراچی کو در پیش انفرادی واجتماعی مسائل اور کراچی کی صورتِ حال کو ایک اہم موضوع کے طور پر بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس کا جائزہ لینے کے لیے آصف فرخی کے افسانوں کا تجزیہ کرنا ناگزیر ہے۔ زیر نظر تنقیدی مقالے کا مقصد آصف فرخی کے افسانوں کا تجزیہ کراچی کے مسائل کی سماجی پیشکش کے تناظر میں کرنا ہے۔

۳۔ مقاصد تحقیق

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:

ا۔ میٹروپولیٹن شہر کی سماجیات کا آصف فرخی کے افسانوں کے تناظر میں تجزیہ کرنا۔

۲۔ کراچی کے انفرادی مسائل (نفسیاتی، سماجی، اور معاشی) کے تناظر میں آصف فرخی کے افسانوں کا تجزیہ کرنا۔

۳۔ کراچی کے اجتماعی مسائل (ماحولیاتی، سیاسی وانتظامی اور امن وامان) کے تناظر میں آصف فرخی کے افسانوں کا تجزیہ کرنا۔

۴۔ تحقیقی سوالات

ا۔ آصف فرخی کے افسانوں میں فرد کی نفسیات کو کراچی کے مسائل کے تناظر میں کس طرح بیان کیا گیا ہے؟

۲۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں کراچی کے انفرادی واجتماعی مسائل کو کس تناظر میں بیان کیا ہے؟

۳۔ آصف فرخی کے افسانوں میں دہشت، کرب اور مایوسی کی کیفیت کے محرکات کیا ہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار

کراچی کا شمار دنیا کے چند بڑے شہروں میں کیا جاتا ہے اور اسے روشنیوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی شہر ہونے کے سبب اس شہر کو پچھلی کچھ دہائیوں سے بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ ادیب اپنے معاشرہ کا عکاس ہوتا ہے۔ وہ اپنے گردو پیش میں رونما ہونے والی صورتِ حال سے متاثر ہوتا ہے جس کا اثر اس کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ آصف فرخی کا تعلق کراچی سے ہے۔ آپ نے کراچی میں اپنا بچپن، جوانی اور زندگی کے آخری دن گزارے۔ آپ کو اپنے آبائی شہر سے فطری محبت اور میلان تھا یہی وجہ ہے کہ آپکی

تحریروں میں کراچی کی صورتِ حال کو خاص اہمیت حاصل ہے اور کراچی کو درپیش انفرادی واجتماعی مسائل کو انتہائی باریک بینی سے بیان کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر تحقیقی مقالے کے ذریعے آصف فرخی کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کراچی کے مسائل کی پیشکش کے تناظر میں کیا گیا ہے۔

نظری دائرہ کار کے ضمن میں "ڈاکٹر جمیل اختر محبی کی کتاب "فلسفۂ وجودیت اور جدید اردو افسانہ" کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ "آج کل خوف و دہشت، سراسیمگی، بوریت، لایعنیت، کرب واضطراب اور تنہائی کے احساس کی جو عام فضا پائی جاتی ہے وہ بہت حد تک اس مشینی تہذیب کی زائیدہ ہے۔ سائنس نے ہماری مدافعت کے لیے ایٹم بم کی ایجاد کی لیکن سائنس دان ایٹم بم بناتے ہوئے یہ بھول گئے کہ اس کی زد میں آخر کون آئے گا۔" مذکورہ تنقیدی کتاب کی مدد سے ہمیں آصف فرخی کے افسانوں کا تجزیہ کراچی کو درپیش انفرادی واجتماعی مسائل کے تناظر میں کرنے اور اس کا ادب میں مقام متعین کرنے میں خاطر خواہ مدد ملی ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار

اس موضوع پر تحقیق کے لیے تاریخی اور دستاویزی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے اس حوالے سے بنیادی مآخذ تک رسائی حاصل کی گئی ہے۔ آصف فرخی اور ان کے افسانوں کے حوالے سے معاصر ادبی جریدوں میں شائع ہونے والے تحقیقی اور تنقیدی مضامین سے بھی استفادہ کیا گیا ہے مزید امدادی کتب تک رسائی کے لیے سرکاری، جامعاتی اور نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

مجوزہ تحقیقی موضوع پر ایم۔اے، ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی یعنی کسی بھی سطح پر کسی قسم کا تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا، جبکہ آصف فرخی کی افسانہ نگاری کا موضوعاتی اور اسلوبی حوالے سے تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جس میں موضوعاتی مطالعہ میں کراچی کی صورتحال کو سرسری بیان کیا گیا ہے۔ آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے مسائل کی پیش کش ایک اہم اور قابل توجہ موضوع ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے نیا بھی ہے۔ جس میں آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے مسائل کی پیش کش کا تفصیلی اور جامع تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

ا۔ رخسانہ پروین، آصف فرخی کی افسانہ نگاری، مقالہ برائے ایم فل، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۱۴ء

۸۔ تحدید

موجودہ تحقیقی مقالے میں آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے مسائل کی پیشکش کا سماجی تجزیہ کیا گیا ہے اس حوالے سے آصف فرخی کے افسانوی مجموعوں میں " آتش فشاں پر کھلے گلاب، اسمِ اعظم کی تلاش، چیزیں اور لوگ، شہر بیتی، شہر ماجرا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا، ایک آدمی کی کمی اور میرے دن گزر رہے "ہیں کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

۹۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ کے طور پر آصف فرخی کے منتخب افسانوں کے حوالے سے شائع ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور کراچی کے مسائل کے حوالے سے لکھے گئے مضامین اور کالموں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ملکی اور غیر ملکی ناقدین کی کراچی کے حوالے سے لکھی گئی تحقیقی و تنقیدی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جس میں عارف حسن کی کتاب "Understanding Karachi" اور لارنٹ گییَر کی کتاب "KARACHI" شامل ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت

اچھا ادیب جہاں معاشرے کی عکاسی کرتا ہے وہیں معاشرتی ارتقا کے لیے درست سمت کا تعین بھی کرتا ہے ۔اس جدید دور میں ترقی کے پیشِ نظر جہاں ایک دوسرے سے رابطے تیز ہوئے ہیں وہیں فکری اختلافات اور سیاسی و سماجی افکار کے تغیر و تبدل کے سبب معاشرتی عدم توازن پیدا ہو رہا ہے۔ جس سے سماجی مسائل جنم لے رہے ہیں۔ ادیب اپنے ماحول کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور ماحول میں موجود سماجی ،سیاسی ،ماحولیاتی اور معاشی مسائل کو ادب کا حصہ بنا دیتا ہے۔ اس تحقیق سے اس سماجی صورتحال کے متعلق آصف فرخی کی فکر اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ موجودہ سماج کے مسائل کی تفہیم اور اصلاح کے پیشِ نظر معاصر ادب کے اس زاویے سے تنقیدی مطالعے پر مبنی تحقیقی سرمایہ میں بھی ایک اچھا اضافہ ہو گا۔ جو ادب کی تفہیم اور ادبی تنقید کے عصری تقاضے ہر دو حوالے سے نہایت اہم ہے۔

ب: بنیادی مباحث

ا۔   میٹروپولیٹن شہر کی سماجیات

ارسطو کے مطابق انسان ایک سماجی جانور ہے۔ انسان اکیلے زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اسی لیے اسے زندگی بسر کرنے کے لیے دوسرے افراد کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی افراد مل کر سماج کو جنم دیتے ہیں۔ سماج افراد کے ایسے گروہ پر مشتمل ہوتا ہے جن کی زندگی کی ضروریات میں مشترکہ روابط کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ سماج کا تعلق ایک قوم، ایک ہی مذہب یا ایک ہی زبان سے تعلق رکھنے والوں سے ہو۔ لفظ "سماج" کو نگینہ جبین نے اپنی اصل کے اعتبار سے سنسکرت سے ماخوذ بتایا ہے۔ "سماج سنسکرت کے دو لفظوں "سم" اور "اج" سے مل کر بنا ہے۔ "سم" کے معنی ہیں اکٹھا یا ایک ساتھ اور "اج" کے معنی ہیں "اکٹھا رہنا۔"[۱]

سماج کو عربی زبان میں معاشرہ کہا جاتا ہے جس کے معنی باہم مل جل کر رہنے، ٹولی، سماج یا انجمن کے ہیں۔ اگر اصطلاحی اعتبار سے معاشرے کے لفظ کو دیکھا جائے تو معاشرے کو مختلف شعبہ جات کے پیش نظر وسیع اور محدود معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں معاشرہ کا متبادل لفظ سوسائٹی مستعمل ہے۔ انگریزی میں وسیع معنوں میں تمام نسل انسانی کو سوسائٹی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور محدود معنوں میں اس سے مراد وہ گروہ ہے جو چند لوگوں یا خاندان پر مشتمل ہو۔ مختلف انگریزی اردو لغات میں سماج کے درج ذیل معنی بیان کیے گئے ہیں۔

فیروز اللغات میں سماج کے معنی "(س۔ آج) (س۔ ا۔ مث۔ مذ) مذکر سوسائٹی، انجمن، کمیٹی، محفل، گروہ، جتھا، ٹولی، منڈلی درج ہیں۔"[۲]

جبکہ وارث سرہندی علمی اردو جامع میں سماج کی تعریف کو یوں بیان کرتے ہیں کہ "سماج، سوسائٹی، اجتماعی زندگی جس میں ہر فرد کو رہنے سہنے، اپنی ترقی و بہبود کے لیے دوسروں سے واسطہ پڑتا ہے۔"[۳]

آکسفورڈ ایڈوانس لرنر لغت "میں سماج کے معنی یوں درج کیے گئے ہیں۔

(1) "People in general living together in communities.

(2) A particular community of people who share the same customs law etc." [4]

یہاں معاشرے کی دو تعریفیں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں پہلی تعریف کا تعلق شعور سے زیادہ فطرت سے ہے۔ جس طرح دیگر تمام انواع کی خاص آبادی ایک جگہ پر مقیم ہوتی ہے ایسے ہی انسان بطور نوع ایک جگہ پر آباد ہوں تو سماج کہلائے گا جبکہ سماج کی دوسری تعریف شعوری سطح کی ہے کہ انسانوں کا وہ گروہ جو فطری تعاون کے علاوہ خاص اقدار کے اشتراک کی وجہ سے آپس میں جڑا ہو سماج کہلاتا ہے۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی "کشاف تنقیدی اصطلاحات" میں لکھتے ہیں کہ "سماجی تعلقات وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے۔" [۵]

گویا سماج انسانی تعلقات کا ایسا مجموعہ ہے جن میں معاشرتی، اخلاقی، روحانی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی تعلقات شامل ہیں۔ اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے انسان ایک دوسرے کی مدد کے تحت ادارے تشکیل دیتے ہیں اور ان اداروں کا مجموعہ معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سماج اور اس کے متعلقات ایک دوسرے کے ساتھ مل کر آگے بڑھتے ہیں۔ ایک سماج کے اندر بہت سی اکائیاں ہوتی ہیں اور یہ اکائیاں مل کر ایک کل کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور پھر کل ایک سماج بن جاتا ہے۔ جب تک کل کی یہ تمام اکائیاں اپنے اپنے حصہ کا کام صحیح طور پر انجام نہ دیں تب تک کوئی بھی سماج اور معاشرہ ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ اور وہی معاشرے ترقی کرتے ہیں جن میں موجود تمام اکائیاں اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیتی ہیں۔

ذرا آگے بڑھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ سماج سے متعلق علم کو سماجیات کہا جاتا ہے۔ سماجیات کی تعریف کرتے ہوئے جیلن اور بلیک مار (Gillian and Blackmar) کا کہنا ہے کہ "سماجیات میں سماج کے ان مظاہر سے بحث ہوتی ہے جو انسانوں کے آپسی میل جول سے پیدا ہوتے ہیں۔" [۶]

مارکس ویبر نے سماجیات سے متعلق یہ تعریف پیش کی ہے کہ "سماجیات سماجی اعمال کی ترجمانی کا نام ہے یا سماجی عادات و اطوار کو سمجھنے کا نام ہے۔" [۷]

انسان ایک سماجی و معاشرتی حیوان ہونے کے ناطے مل جل کر زندگی بسر کرتا ہے اور اپنی اِسی فطرت کا اظہار کبھی قبیلے، دیہات، شہر، ملک یا سلطنت کی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی طرح مل جل کر رہنے سے معاشرے وجود میں آتے ہیں یہ معاشرے اپنے اندر مختلف رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں اور ہر رنگ اپنے اندر ایک مکمل

کائنات لیے ہوتا ہے۔ سماج میں رہنے والے افراد ایک مذہب، ایک زبان اور ایک تہذیب سے تعلق رکھنے والے افراد بھی ہوسکتے ہیں اور مختلف مذاہب،زبان اور تہذیب سے تعلق رکھنے والے افراد بھی ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح ہر جگہ کا سماج بھی اپنے ماحول اور طرزِ زندگی کے حوالے سے مختلف نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ مثلاً دیہی معاشرہ شہری معاشرے سے مختلف ہوتا ہے اور اسی طرح اس میں رہنے والے افراد کا رہن سہن، طریق معاشرت اور مسائل بھی مختلف ہیں۔ اگر شہری معاشرہ یا سماج کی بات کی جائے تو اس کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ شہر کیا ہے؟ یہ کیسے وجود میں آتا ہے اور شہر کی تعریف کیا ہے؟ یہاں بہت کم سماجی اصطلاحیں ایسی ہیں جن پر تمام سماجی ماہرین متفق ہیں شہر کی تعریف بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیوئس ممفورڈ جو کہ ایک امریکی مورخ، ماہر عمرانیات، ٹیکنالوجی کا فلسفی اور مشہور نقاد تھا نہ صرف یہ بلکہ شہر اور شہری فن تعمیر کے حوالے سے بھی اپنی پہچان آپ تھا۔ اس نے اپنے مضمون (City, Form and function) جو کہ سماجیات کے بین الاقوامی انسائیکلوپیڈیا میں شائع ہوا۔ اس میں شہر کی تعریف کے بارے میں لکھا ہے کہ شہر انسانی آبادکاری کی ایک شکل کے طور پر تہذیب کے آغاز سے تعلق رکھتا ہے، یہ طویل عرصے تک علمی جانچ سے بچ گیا اور اس کی تعریف اب بھی ماہر سماجیات کے درمیان زیر بحث ہے۔

بہت سے دوسرے سماجی زمروں کی طرح یہ شہر بھی ایک تجرید ہے لیکن کچھ عناصر ایسے ہیں جن پر شہر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں رہائش، ڈھانچے، ذرائع نقل و حمل، تنصیبات وغیرہ یہ سب عناصر مختلف قسم کے ٹھوس ادارے ہیں جو کہ اسے شہر بنانے میں مجموعی طور پر فعال انضمام ہیں۔

اس کے باوجود شہر میں صرف ایک فنکشن کارفرما نہیں ہوتا ہے بلکہ بہت سے افعال کی درجہ بندی ہوتی ہے اور یہ تمام افعال سب شہروں میں موجود نہیں ہوتے۔ یہ شہر بہ شہر اور وقتاً فوقتاً مختلف ہوسکتے ہیں۔ ایسے میں شہر کی تعریف کرنے کے مختلف طریقے ہیں جن میں قانونی، شماریاتی، ثقافتی، پیشہ ورانہ، سماجی اور اقتصادی شامل ہیں۔ قانونی طور پر اگر شہر کی تعریف کی جائے تو بہت سے ممالک میں شہر کو قانونی اصطلاحات میں شامل کیا گیا ہے۔ قانونی طور پر ایک اعلان کے ذریعے جسے چارٹر کہا جاتا ہے شہر بنایا جاتا ہے جو کہ اعلیٰ اتھارٹی کی جانب سے عطا کیا جاتا ہے۔ بہت سی وجوہات کی بنا پر شہر کی یہ تعریف اور طریقہ کار غیر تسلی بخش ہے۔

شماریاتی اشارے کے ذریعے بھی شہر کی تعریف کی جاتی ہے جس کے مطابق یو۔ ایس۔ بیورو آف سنس علاقوں کو جن میں پچیس سو یا اس سے زائد باشندے مقیم ہوں شہر تصور کرتا ہے۔ یہ طریقہ شماریات دانوں کی ضرورت تو پوری کرتا ہے لیکن بہت کم سماجی بصیرت فراہم کرتا ہے۔ زیادہ تر یورپی ممالک ۱۸۴۲ء میں فرانس

کی قائم کردہ شماریاتی تعریف کی پیروی کرتے ہیں جس کے تحت شہر کے لیے دو ہزار باشندوں پر مشتمل آبادی کا ہونا ضروری ہے۔ شہر کی یہ تعریف اعداد و شمار کے لحاظ سے منظور کی گئی تھی۔ اس اعداد و شمار کو شماریات کے بین الاقوامی بیورو میں ۱۸۸۷ء میں منظور کیا جبکہ عالمی سطح پر اس تعریف کو منظور نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر کوریا شہر کے لیے ۴۴۰۰۰ چوالیس ہزار کم از کم حد مقرر کرتا ہے جبکہ ہندوستان میں شہر کے لیے کم از کم تعداد پانچ ہزار ہے۔

شہر کی تعریف کرنے کا ایک اور معیار آبادی کی کثافت کی بنیاد پر ہے۔ افراد کی تعداد پر مبنی تعریف کی طرح بہت سی وجوہات کی بنا پر آبادی کی کثافت پر مبنی تعریفوں پر بھی سوال اٹھایا گیا۔ یہ بتانا ناممکن ہے کہ کوئی بھی بستی آبادی کی کتنی تعداد پر شہر میں تبدیل ہو گی کیونکہ کچھ شہر گنجان آباد اور کچھ شہر خلا کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ول کوکس کثافت کے معیار سے مطمئن نہیں اس لیے اس نے شہر کی وضاحت کرنے کے لیے پیشہ ورانہ ڈھانچہ پیش کیا۔ ول کوکس کی تعریف کے مطابق انھوں نے ایک ضلع کو صرف اس صورت میں دیہی کہا جس میں زراعت لوگوں کا واحد ذریعہ معاش یا پیشہ ہو، جبکہ شہر وہ جگہیں ہیں جن میں زراعت نہ کی جائے اور نہ ہی یہ لوگوں کا ذریعہ معاش ہو۔ شہر ایک ایسی جگہ ہے جو اس قدر وسعت پا چکی ہے کہ وہاں کے رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے واقفیت نہیں رکھتے جبکہ چھوٹے شہروں کے لیے یہ تعریف غلط ہو گی۔

جس طرح دیہات کی ترقی یافتہ شکل کو قصبہ اور قصبے کی ترقی یافتہ شکل کو شہر کہا جاتا ہے اسی طرح شہر بھی کچھ خصوصیات کی بنا پر ماہر سماجیات کی جانب سے بہت سے درجات میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ میٹروپولیٹن جسے میٹروپولس بھی کہا جاتا ہے۔ شہر کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ ماہر سماجیات لیوس ممفورڈ نے تکنیکی سطحوں کی بنیاد پر شہروں کی درجہ بندی کی ہے۔

۱۔ ای اوپولس Eopolis

۲۔ پولس Polis

۳۔ میٹروپولس Metropolis

۴۔ میگاپولس Megapolis

۵۔ٹائیرنوپولس Tyranopolis

۶۔نیکروپولس Necropolis

لیوس ممفورڈ کی اس درجہ بندی کے تحت میٹروپولس تیسرے نمبر پر آتا ہے اور یہ تکنیکی درجہ بندی کے لحاظ سے مثالی شہروں میں شمار کیا جاتا ہے جو ہر لحاظ سے وہاں رہنے والوں کے لیے مثالی اور بہترین زندگی گزارنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

میٹروپولس یونانی زبان کا لفظ ہے جو کہ دو الفاظ meter یعنی ماں اور Polis یعنی شہر پر مشتمل ہے۔ آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری میں میٹروپولس یا میٹروپولیٹن کے یہ معنی درج ہیں کہ "کسی ملک کا سب سے بڑا شہر یا صدر مقام، دارالحکومت، ام البلاد، صدر مقام کے بشپ کی عملداری یا منصب، کاروائیوں کا مرکز یا گڑھ۔"[۸]

جبکہ قومی انگلش اردو ڈکشنری میں میٹروپولیٹن کے معنی "ام البلاد، بڑا شہر، بڑے شہر کی خصوصیات کے حامل شہر کے ہیں۔"[۹]

یعنی میٹروپولیٹن شہر کو ام البلاد کہا جا سکتا ہے۔ دور قدیم میں میٹروپولس کی اصطلاح ایک مخصوص قسم کے شہر کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ یہ اصطلاح ایسے شہر کے لیے استعمال کی جاتی جو کسی سلطنت کا دارالحکومت ہو جہاں سے باقی سلطنت یا کم از کم چھوٹے بڑے علاقوں پر حکومت کی جا سکے۔ اس طرح ایک میٹروپولیٹن شہر کا درجہ صوبائی شہر سے کافی زیادہ ہو گا جبکہ دور جدید میں کسی بھی بڑے شہر کو میٹروپولیٹن خیال کیا جا سکتا ہے چاہے وہ کسی سلطنت کا دارالحکومت نہ ہو امریکا میں اس کا دارالحکومتی شہر ایک بڑا شہر نہیں ہے۔ اسی طرح امریکی ریاستوں میں کم از کم ایک بڑا شہر موجود ہے مگر وہ میٹروپولیٹن تو ہے مگر اس کا دارالحکومت نہیں ہے۔ اسی طرح امریکہ میں میٹروپولیٹن شہر کی اپنی آبادی سے زیادہ اس کے ارد گرد کے علاقوں کی آبادی ہے۔ اس طرح عام طور پر ایک بڑے شہر اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کی آبادی کو ملا کر ایک میٹروپولیٹن شہر کی آبادی کے طور پر شائع کیا جاتا ہے۔

اگر ہم دور قدیم کی روایت کی پیروی کریں تو اس کے مطابق کسی بھی ریاست کے دارالحکومت کو میٹروپولیٹن کا درجہ دیا جائے گا۔ بے شک وہ ریاست کے لیے معاشی و ثقافتی مرکز کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ لہذا میٹروپولس شہر کے جدید معنی ایسی جگہ کے ہیں جو کسی بھی ملک یا ریاست کا سیاسی، ثقافتی یا معاشی مرکز ہو اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ یہ سب خصوصیات اس میں موجود ہوں۔

جس طرح کسی جگہ کو شہر تسلیم کرنے کے لیے ہر ملک اور ریاست کے اپنے اصول اور ضابطے ہیں اسی طرح میٹروپولیٹن شہر کی تعریف بھی ہر ریاست میں مختلف پیش کی گئی۔ بھارت میں میٹروپولیٹن شہر ایسے شہر کو قرار دیا جاتا ہے جس کی آبادی ایک ملین یعنی دس لاکھ سے زیادہ ہو۔ اس لحاظ سے انڈیا میں راجکوٹ سب سے چھوٹا میٹروپولس شہر ہے جس کی آبادی تقریباً دس لاکھ سے کچھ زائد ہے جبکہ انڈیا کا سب سے بڑا میٹروپولس شہر ممبئی ہے جس کی آبادی تقریباً دو کروڑ کے قریب ہے۔ اگر پاکستان کی بات کی جائے تو میٹروپولیٹن شہر کے حوالے سے پاکستان میں اس کے لیے کوئی حتمی تعریف دیکھنے کو نہیں ملتی مگر بین الاقوامی تعریفوں کے مطابق کراچی کو پاکستان کا سب سے بڑا اور میٹروپولیٹن شہر تصور کیا جاتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ معاشی لحاظ سے یہ ملک کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ملک کے ہر حصے سے افراد یہاں حصول معاش کے لیے آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ شہر میٹروپولیٹن ہونے کے ساتھ ساتھ کثیر الثقافتی شہر بھی ہے۔ اس شہر میں ملک کی ہر زبان بولی جاتی ہے مختلف مذاہب اور ثقافت سے تعلق رکھنے والے افراد اس شہر میں آباد ہیں۔ ۲۰۰۲ کی رپورٹ کے مطابق کراچی کی آبادی دو کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ پاکستان کے دوسرے میٹروپولیٹن شہروں میں لاہور، فیصل آباد، پشاور اور اسلام آباد شامل ہیں۔ ان شہروں میں ارد گرد کے چھوٹے بڑے شہروں میں رہنے والوں کے لیے روزگار کے مواقع معاش کے ذرائع، ایئرپورٹ اور ہر طرح کی بنیادی انسانی سہولیات موجود ہیں۔

میٹروپولیٹن شہر کراچی جس میں نہ صرف اپنے شہر کے باشندوں بلکہ ملک کے دوسرے صوبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے روزگار کے مواقع موجود تھے۔ پچھلی کچھ دہائیوں سے سنگین مسائل کا شکار ہے۔ اس مقالے میں کراچی کے انفرادی، اجتماعی، نفسیاتی، سیاسی وانتظامی، ماحولیاتی اور امن وامان سے متعلق مسائل کو آصف فرخی کے افسانوں کی روشنی میں سامنے لایا گیا ہے۔

۲۔ آصف فرخی تعارف وتصانیف

آصف فرخی کا شمار موجودہ عہد کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے آپ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا اور اس میں اپنے تخلیقی جوہر دکھانے کے بعد افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کی جس میں جلد ہی اپنے منفرد اسلوب اور اچھوتے موضوعات کے باعث اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔ آصف فرخی کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر دن رات اس کی خدمت میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ آصف فرخی نے نہ

صرف افسانہ نگاری میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے بلکہ تنقید و تحقیق، سفر نامہ نگاری اور مترجم کے طور پر بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے نہ صرف یہ بلکہ آپ نے "دنیازاد" رسالہ کے مدیر کے طور پر بھی اپنی خدمات سرانجام دیں۔

آصف اسلم جو کہ ادبی دنیامیں آصف فرخی کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں ۱۶/ستمبر/۱۹۵۶ء کو کراچی کے علاقے ناظم آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام "اسلم فرخی" ہے جو کہ خود بھی ادبی دنیامیں اپنی پہچان آپ رکھتے ہیں۔۱۹۲۳ء کو بھارت کے شہر لکھنو میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد بھارت کے علاقے ضلع فرخ آباد کے چھاؤنی قصبے فتح گڑھ جو کہ دریائے گنگا کے دائیں کنارے پر واقع ہے وہاں سے ہجرت کر کے ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں آباد ہوگئے۔ اسلم فرخی کا تعلق ایک پڑھے لکھے ادبی گھرانے سے تھا آپ کے والد محمد احسن بھی اردو ادب سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد احسن نے بچوں کے حوالے سے بہت سا ادب تخلیق کیا جسے "فیروز سنز" نے شائع بھی کیا۔ اسلم فرخی کے بھائی انوار احسن صدیقی بھی ایک ادیب اور شاعر تھے چونکہ اسلم فرخی بذات خود بھی ادب کی دنیامیں اپنی ایک الگ شناخت رکھتے تھے آپ بہترین شاعر نقاد اور ماہر لسانیات تھے آپ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بھی وابستہ رہے آپ نے بچوں کے لئے بہت سا ادب تخلیق کیا اور ریڈیو پاکستان میں بھی ادبی پروگرام کے سلسلے میں اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے جب کہ آپ کی زوجہ اور آصف فرخی کی والدہ تاج بیگم دلی میں پیدا ہوئیں۔ دلی سے اپنی والدہ کے تعلق کو بیان کرتے ہوئے آصف فرخی کہتے ہیں کہ

> " دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب" اور "دلی کے کوچے نہ تھے اوراق مصور تھے" وغیرہ اس شہر کے بارے میں جہاں میری امی پیدا ہوئی تھی اور جس نسبت سے میرے ننھیال والے اپنے نام کے آگے اس شہر کا نام لکھا کرتے تھے۔"[۱۰]

آصف فرخی کی والدہ تاج بیگم کا تعلق بھی ایک ادبی گھرانے سے ہے۔ آپ اردو کے پہلے ناول نگار "ڈپٹی نذیر احمد" کی پڑپوتی ہیں اور مشہور خاکہ نگار "شاہد احمد دہلوی" کی بھتیجی ہیں۔ تاج بیگم کے والد کا نام "سراج الدین" تھا۔ تاج بیگم کو بچپن ہی سے پڑھنے کا بہت شوق تھا مگر ابھی وہ تعلیم حاصل کر ہی رہی تھیں کہ اسی دوران ان کی شادی اسلم فرخی سے ہوگئی مگر آپ نے شادی کے بعد اپنی تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھا اور باقی کی تعلیم شادی کے بعد حاصل کی۔ تعلیم کی حصول یابی کے لئے اپنی لگن اور دلچسپی سے متعلق تاج بیگم بتاتی ہیں کہ

"جن دنوں میرے امتحانات ہو رہے تھے آصف بہت سخت بیمار تھا وہ میری گود میں لیٹا رہتا اور میں امتحانات کی تیاری کرتی۔"[۱]

یعنی گھریلو ذمہ داریوں اور بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ تاج بیگم نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا۔ آپ کی اسی محنت اور لگن کی بدولت آپ نے ایم اے اردو پہلے درجے میں پاس کیا اور آپ ایم اے اردو پہلے درجے میں پاس کرنے والی پہلی خاتون ہیں جس کے انعام کے طور پر آپ کو "بابائے اردو گولڈ میڈل" سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ آپ کی بہترین کارکردگی پر سندھ حکومت نے آپ کو "تمغہ فضیلت" سے بھی نوازا۔ تاج بیگم دو کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں۔ یہ کتابیں آپ نے اپنے پردادا ڈپٹی نذیر احمد اور چچا شاہد احمد دہلوی کے حوالے سے تصنیف کی ہیں۔

آصف فرخی کا تعلق ادبی گھرانے سے ہے۔ آپ اپنے والدین کی سب سے پہلی اولاد ہیں۔ آپ کے والدین کو قدرت نے دو بیٹوں کی نعمت سے نوازا۔ آصف فرخی کے چھوٹے بھائی جن کا نام طارق اسلم ہے وہ سوئی گیس کے محکمے سے منسلک ہیں جبکہ آصف ادب سے منسلک ہیں۔

آصف فرخی نے اپنی تعلیم کا آغاز سینٹ جوڈز سکول کراچی سے کیا اور اس کے بعد پانچویں جماعت میں آپ نے سینٹ پیٹرک اسکول جو کہ کراچی ہی میں واقع ہے میں داخلہ لے لیا اور پھر وہیں سے ۱۹۷۴ء میں میٹرک کا امتحان بہترین نمبروں میں پاس کرنے کے بعد ۱۹۷۶ء میں ڈی جے سائنس کالج کراچی سے ایف ایس سی پری میڈیکل کا امتحان پاس کیا جس پر آپ کو گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کہتے ہیں کہ

> " آصف بچپن میں زیادہ کھیل کود کا شوقین نہ تھا۔ مطالعے سے رغبت ضرور تھی۔ ادب سے دلچسپی زیادہ تھی۔ اس لیے ایف ایس سی کے بعد آصف نے ضد کی کے وہ لٹریچر پڑھے گا مگر قریبی دوستوں حسن عسکری، احسن فاروقی اور عصمت چغتائی کے کہنے پر اسے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنا پڑی۔ عصمت نے تو اس کو بلا کر سمجھایا کہ دیکھو ادب کو صرف محبوبہ سمجھو بیوی نہ بناؤ۔ اس طرح آصف کو میڈیکل کی تعلیم کی طرف راغب کیا۔"[۲]

آصف فرخی کو بچپن ہی سے ادب سے بہت لگاؤ تھا مگر بڑوں کے سمجھانے پر ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۸۴ء میں وہاں سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد سول ہسپتال کراچی میں ملازمت اختیار کرلی۔

آپ نے ۱۹۸۵ء میں آغا خان یونیورسٹی کراچی میں بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ ۱۹۸۶ء میں آصف فرخی مزید تعلیم کے حصول کے لیے امریکہ چلے گئے اور ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ سے انٹر نیشنل ہیلتھ کنسنٹریشن ود پبلک ہیلتھ میں ماسٹرز کی ڈگری لے کر ۱۹۸۸ء میں پاکستان واپس لوٹے۔ پاکستان واپس آنے کے بعد آپ آغا خان یونیورسٹی میں ۱۹۹۳ء تک بطور انسٹرکٹر اپنی خدمات پیش کرتے رہے۔ اس کے علاوہ آپ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسیف سے بھی ۱۹۹۴ء میں وابستہ ہوئے اور اپنی خدمات سر انجام دیں۔ آپ نے یونیسیف میں ۲۰۱۳ تک اپنی خدمات پیش کیں۔ اس کے بعد آصف فرخی درس و تدریس کے شعبے کے ساتھ منسلک ہو گئے اور حبیب یونیورسٹی کراچی میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر اپنی خدمات پیش کیں۔ آپ حبیب یونیورسٹی کراچی میں بطور پروفیسر اپنے فرائض نبھا رہے تھے کہ اسی دوران یکم جون ۲۰۲۰ کو دل کا دورہ پڑنے سے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ آصف فرخی نہ صرف اپنے طب کے پیشے اور تخلیقی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیوں میں بھی بہت متحرک تھے۔ آپ نے کراچی میں ادبی میلے کی روایت ڈالی اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے ساتھ مل کر کراچی لٹریچر فیسٹیول کی بنیاد رکھی۔ آپ نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی ادبی محفلوں اور کانفرنسوں میں بھی شرکت کرتے یہی وجہ ہے کہ آپ ادبی حلقوں میں ایک نامور اور متحرک ادبی شخصیت کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آصف فرخی نے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز ۱۹۸۶ء میں کیا۔ آپ کی شریک حیات "سیمیں" معروف نقاد "ممتاز حسین" کے خاندان سے قریبی تعلق رکھتی ہیں اور انگریزی کی استاد ہیں۔ قدرت نے آپ کو دو بیٹیوں سے نوازا بڑی بیٹی کا نام غزل جب کہ چھوٹی بیٹی کا نام انوشے ہے۔ غزل نے "لمس" سے ماسٹرز کیا ہے اور آج کل امریکہ میں عمرانیات میں پی ایچ ڈی کر رہی ہیں جبکہ انوشہ گریجویشن کرنے کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی کے ساتھ منسلک ہو گئی ہیں۔ آصف فرخی کے والد آپ کی زندگی میں ہی وفات پا گئے تھے جب کہ آپ کی والدہ تاج بیگم حیات ہیں اور آج کل سخت علیل ہیں۔ آصف فرخی کی اچانک موت نے ادبی دنیا میں گہرے غم کی ایک لہر دوڑادی ہے جب پوری دنیا مجموعی طور پر غم اور مایوسی کی کیفیت میں مبتلا ہے ایسے میں آصف فرخی کی وفات کی خبر نے دنیا اور طب کے طالب علموں کو گہرے غم میں مبتلا کر دیا۔ آصف نے نہ صرف اردو زبان و ادب کے لیے بے پناہ کام کیا بلکہ غیر ملکی زبان و ادب کے تراجم کر کے نہ صرف اردو زبان و ادب کو ترویج دی بلکہ غیر ملکی ادب کو بھی اردو زبان بولنے اور سمجھنے والوں سے متعارف کروایا۔ آصف فرخی کا نام ادبی دنیا میں ہمیشہ ایک چمکتے ستارے کی طرح چمکتا دمکتا رہے گا۔

آصف اسلم فرخی کا تعلق ادبی گرانے سے ہے یہی وجہ ہے، کہ آپ نے ایک خالص ادبی ماحول میں پرورش پائی جس کی بدولت آپ کے ادبی ذوق کو مزید فروغ ملا اور طب کا پیشہ اختیار کرنے کے باوجود ادب کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ آصف فرخی نے لکھنے کا آغاز سنہ ۱۹۷۸ء میں ہی کر دیا تھا جب آپ کی پہلی کہانی "اظہار" نامی رسالے میں شائع ہوئی جب کہ آپ کی دوسری کہانی رسالہ ماہ نو جسے کشور ناہید مرتب کرتی تھیں اس میں شائع ہوئی اس کے بعد تخلیقی سفر کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔

I۔ آتش فشاں پر کھلے گلاب:

آتش فشاں پر کھلے گلاب آصف فرخی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ پہلی مرتبہ طارق پبلی کیشنز ۱۴۔بی الہلال سوسائٹی، کراچی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ اس میں کل سترہ(۱۷) افسانے ہیں جن میں "خواب اور عذاب"، "آتش فشاں پر ناچنے والا چوہا"، "ناقتہ اللہ" اور "غزال رمیدہ" وغیرہ شامل ہیں۔

II۔ اسم اعظم کی تلاش:

یہ آصف فرخی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جو کہ پہلی مرتبہ احسن مطبوعات ۱۶۔بی الہلال سوسائٹی یونیورسٹی روڈ، کراچی سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل پچیس (۲۵) افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ جن میں سے "جشن مرگ انبوہ"، اصحاب کہف"، حکایت نیند سے واپس آنے والوں کی"، جلتے شہر میں بانسری کی دھن" اور "کوفے کا شہر" اپنے اچھوتے موضوعات کی وجہ سے مشہور ہیں۔

III۔ چیزیں اور لوگ:

آصف فرخی کا تیسرا افسانوی مجموعہ "چیزیں اور لوگ" پہلی مرتبہ احسن مطبوعات بی ۱۵۵ بلاک ۵ گلشن اقبال، کراچی سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل پندرہ افسانے شامل ہیں۔ جن میں سے چند کے نام یہ ہیں "زمین کی نشانیاں"، "بحیرہ مردار"، "سمندر"، "دیمک"، "ستارہ غیب" اور "من شر ما خلق" وغیرہ شامل ہیں۔

IV۔ شہر بیتی:

" شہر بیتی" کی اشاعت اول مکتبہ دانیال، کراچی سے ۱۹۹۵ء میں ہوئی۔ یہ آصف فرخی کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔اس میں کل بیس افسانے شامل کیے گئے ہیں اور یہ تمام کے تمام افسانے کراچی میں امن کی بگڑتی صورتحال اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے مسائل پر مبنی ہیں۔

V۔ شہر ماجرا:

یہ افسانوی مجموعہ بھی مکتبہ دانیال، کراچی سے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا گیا۔ یہ افسانوی مجموعہ بھی کراچی میں امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورتحال کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

VI۔ میں شاخ سے کیوں ٹوٹا:

" میں شاخ سے کیوں ٹوٹا" آصف فرخی کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے۔اس مجموعے کو فضلی سنز پبلشرز، کراچی نے پہلی مرتبہ ۱۹۹۷ء میں شائع کیا۔اس میں کل بارہ افسانے ہیں ان افسانوں کے نام یہ ہیں۔ "ناف"، "الرجی"، " پھپھوندی"، "السلام علیکم یا اہل القبور"، "گوہائی"، "کھجلی"، "شہری"، "کیلشیم"، "شہر میں آوارہ"، "بمبئی"، "چپ دریا" اور "درخت کی دعا" وغیرہ وغیرہ۔

VII۔ ایک آدمی کی کمی:

"ایک آدمی کی کمی" یہ آصف فرخی کا ساتواں افسانوی مجموعہ ہے جسے فضلی سنز پبلشرز، کراچی نے پہلی مرتبہ ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔اس میں کل بارہ (۱۲) افسانے شامل ہیں۔ جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ "پاڈا"، "ہنس پکھی"، "اس آدمی کی کمی" اور "واچوڑے کی واٹ" وغیرہ۔

VIII۔ میرے دن گزر رہے ہیں :

یہ افسانوی مجموعہ شہرزاد پبلشرز، کراچی سے ۲۰۰۹ میں شائع ہوا۔ یہ آصف فرخی کا آٹھواں اور آخری افسانوی مجموعہ ہے۔ اس افسانوی مجموعہ میں کل بیس افسانے شامل ہیں اور ہر افسانہ اپنے اندر منفرد موضوع لیے ہوئے ہے۔ چند کے نام یہ ہیں۔"پرندے کی فریاد"، "کہر"، "سمندر کی بیماری"، " شہر تہہ آب"، "ویلنٹائن"، "مرنا اگر ایک بار ہوتا" "سمندر کی بیماری" اور "حتمی سفارشات" وغیرہ۔

آصف فرخی کے کل آٹھ افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کا ایک مشہور افسانہ "بن کے" جو کہ عرفان جاوید کی مرتبہ کتاب میں شامل ہے اس کتاب کا نام "انتخاب اور مقدمہ عرفان جاوید" ہے۔ اس کتاب کو سنگ میل پبلشرز، لاہور نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا ہے۔ اس مُرتبہ کتاب میں آصف فرخی کے کل ۳۱ افسانے منتخب کر کے شامل کیے گئے ہیں۔ جن میں ایک "بن کے" بھی ہے۔

آصف فرخی نے سفر نامے بھی لکھے۔ آپ کا پہلا سفر نامہ "شہر علامات" کے نام سے سنگ میل پبلشرز، لاہور نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔ آپ کا دوسرا سفر نامہ "قید مقام" کے نام سے شہرزاد پبلشرز، کراچی نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔ آصف فرخی کا تیسرا اور آخری سفر نامہ ۲۰۱۴ء میں "سفر کے خوش نصیب" کے نام سے سنگ میل پبلشرز، لاہور نے شائع کیا۔

تنقید کے میدان میں بھی آصف فرخی نے اپنی تنقیدی بصیرت کا خوب جوہر دکھایا۔ آپ کی دونوں تنقیدی کتب شہرزاد پبلشرز، کراچی نے شائع کیں۔ "عالم ایجاد" ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ جبکہ "نگاہ آئینہ ساز میں" ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ آپ کی تنقیدی کتاب "درمیان سے سنی" جو کہ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

آصف فرخی کی "حرف من وتو" کے نام سے ایک کتاب بھی ہے جس میں مختلف شخصیات کے انٹرویوز کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب نفیس اکیڈمی، کراچی نے پہلی مرتبہ ۱۹۸۹ء میں شائع کی۔

ترجمہ کے میدان میں بھی آصف فرخی نے بہت کام کیا ہے۔ آپ نے دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھے گئے ادب کو اردو زبان میں منتقل کیا اور اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لئے خیالات کے نئے در کھولے۔ آپ نے جن کتابوں کو ترجمہ کر کے شائع کیا ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں۔

تغلق، "گریشن کرناڈ"، احسن مطبوعات، کراچی، ۱۹۸۷ء۔

ترانہ، "آئین رینڈ"، احسن مطبوعات، کراچی، ۱۹۸۷ء۔

تماشا گر، "ستیہ جیت رے"، قوسین پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

فونتامارا، "اگنارزیو سلونے"، مشعل پبلشرز، ۱۹۹۲ء۔

ماتم ایک عورت کا، "عمر ریو ابیلا"، فضلی پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۵ء۔

مٹھی بھر ستارے، "رفیق نامی"، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۷ء۔

سدھارتھ، "ہر من ہیسے"، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء وغیرہ آصف فرخی کی ترجمہ کردہ کتابوں میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آصف فرخی نے بہت سے غیر ملکی ادب کے تراجم کیے ان تمام کی تفصیل فل الحال یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

آصف فرخی نے بچوں کے لیے بھی ادب تخلیق کیا بچوں کے لیے آپ نے دو کتب تخلیق کیں۔ اس حوالے سے آپ کی پہلی تخلیق کردہ کتاب ۱۹۹۸ء میں "تھوڑی تارا ماتھے چاند" کے نام سے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی نے شائع کی۔ جب کہ آپ کی دوسری کتاب بھی "بی پٹکی" کے نام سے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی سے ۱۹۹۸ء میں ہی شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ آپ نے بہت سی کتابوں کو مرتب کیا جن میں "منٹو نوری نہ ناری ممتاز شیریں، "داستان طراز" از قرات العین حیدر، "ذکر اغیار" از شاہ محمد پیرزادہ، "فکر ایاز" از شاہ محمد پیرزادہ، "گنی چنی تحریریں" از انتظار حسین، "بزم صبوحی" از اشرف صبوحی، اور "بزم شاہد" از شاہد احمد دہلوی وغیرہ انکی اہم مرتب کردہ کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

ج۔ آصف فرخی کی افسانہ نگاری

آصف فرخی بیسویں صدی کے افسانوی منظر نامے پر ان افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جو کسی بھی عام واقعہ، منظر اور کہانی کو افسانہ بنانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ آصف فرخی کی فنکارانہ فکر، طرز احساس اور تخلیقی شعور ہمارے سامنے سماجی، تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی طور پر مزید واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ اردو افسانہ اپنے اندر بے شمار موضوعات اور جہتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ دنیا میں موجود بے شمار مسائل کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے نہ صرف ظلم و جبر کرنے والوں بلکہ اس ظلم و جبر

کے شکار استحصال زدہ طبقات کو بھی موضوع بنایا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ دنیا میں موجود مختلف ممالک کے اندرونی مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ موجودہ عہد کے وہ افسانہ نگار جنہوں نے دنیا کو درپیش مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ان میں آصف فرخی کا نام اہم اور نمایاں ہے۔

آصف فرخی کے افسانوں کے موضوعات پر نظر ڈالنے سے پہلے اگر ان کے افسانوی مجموعوں کے عنوانات پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے ہر افسانوی مجموعہ کا عنوان اپنے اندر گہرے معنی لیے ہوئے ہے۔ افسانوی مجموعے کے عنوان سے ہی ہمیں مجموعے میں موجود افسانوں کے موضوعات اور ان میں پوشیدہ معنی بخوبی سمجھ آجاتے ہیں۔ آصف فرخی کے پہلے افسانوی مجموعے کا عنوان "آتش فشاں پر کھلے گلاب" ہے، اس مجموعے میں موجود زیادہ تر کہانیاں یادوں کے دفینے ہیں۔ جن میں ایک خاص لذت محسوس کی جاسکتی ہے حالانکہ جو یادیں اور ماحول ان افسانوں کی فضا ہے وہ انتہائی تکلیف دہ ہے مگر اس فضا میں رہنے والا اسی ماحول سے آسودگی پاتا ہے۔ آصف فرخی اپنے افسانوی مجموعہ کا آغاز ہی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ قاری مجموعے میں موجود افسانوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ "آتش فشاں پر کھلے گلاب" کا آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ

> " خواتین وحضرات! آپ کا پائلٹ آپ سے مخاطب ہے۔ اس وقت ہم آواز سے تیز پرواز کرتے ہوئے رفعت خیال کی جانب سفر کر رہے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنی حفاظتی پیٹیاں کھول دیں اور ذہنوں کو آزاد چھوڑ دیں۔ "[۳]

ان کے دوسرے افسانوی مجموعے کا عنوان "اسم اعظم کی تلاش" ہے۔ اس میں ایسے افسانے شامل کئے گئے ہیں جن کے کردار پیچیدہ نوعیت کے ہیں اور وہ زندگی کے کٹھن راستوں پر کسی ایسے اسم اعظم کی تلاش میں ہیں جو انہیں زندگی کے اس گورکھ دھندے سے باہر نکال سکے۔ "چیزیں اور لوگ" آصف فرخی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں شامل افسانے اس مجموعہ کے عنوان کی طرح اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں کہ ہم جس ماحول میں زندگی گزارتے ہیں اس میں موجود چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی انسان پر اپنا اثر ضرور ڈالتی ہے اور پھر انہی چیزوں سے واقعات رونما ہوتے ہیں اور واقعات کہانیوں کا روپ دھار کر افسانہ نگار کے ہاتھ میں افسانہ بن جاتے ہیں۔ آصف فرخی کے افسانوی مجموعے شہر بیتی اور شہر ماجرا اپنے عنوانات سے ہی ظاہر ہیں کہ یہ اپنے اندر شہر کراچی کا ماجرا اور روداد لیے ہوئے ہیں۔ "شہر بیتی" میں فارسی کہاوت بیان کرنے کے بعد

آندرے زپوریسکی (Andrze szczypiorski) کے ان الفاظ کے ذریعے مجموعے میں موجود افسانوں کا نچوڑ بیان کیا گیا ہے

> "Terror is fascinating and awful when it disrupts normal existence. Ghosts are sinister when they appear in normal orderly life.Hell is threatening when it await us at the end of our existence but terror as a permanent condition ghosts amid everyday life, hell at every street-corner that merely trivial." [14]

اس مجموعہ میں موجود افسانے شہر کے سارے منظر کو ہماری آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں۔ "شہر ماجرا" کے آغاز میں شہر کی کربناک اور خوفناک صورتحال کی غمازی کے لیے غالب، ادونس اورانوراحسن صدیقی کی شاعری کو تحریر کیا گیا ہے۔ جس سے شہر کی خوف ودہشت بھری صورت حال کی عکاسی ہوتی ہے۔ "شہر بیتی اور "شہر ماجرا" میں آصف فرخی کراچی شہر کی کہانی سناتے ہیں جہاں لاکھوں لوگ پناہ گزین ہیں اور وہ اہل نظر کے لئے عبرت ناک منظر پیش کر رہا ہے۔ان دونوں مجموعوں میں شامل تمام افسانے کراچی کی صورتحال کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ آصف فرخی کا ایک افسانوی مجموعہ "میں شاخ سے کیوں ٹوٹا" کا عنوان اقبال کے ایک شعر سے لیا گیا ہے۔اس مجموعے سے افسانہ نگار کا مکمل تہذیبی شعور ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس میں انفرادیت کا جذبہ بھی ہے مگر یہ ایسی انفرادیت ہے کہ جس میں انسان اپنی تہذیب کے ساتھ پیوست رہے اور یہ پیوستگی کا عمل رک جائے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسا کوئی پتا اپنی شاخ سے جدا ہو کر بے معنی ہو جاتا ہے۔

" ایک آدمی کی کمی" آصف فرخی کا سب سے چھوٹا اور مختصر افسانوی مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں اندرون سندھ کی تہذیب اور وہاں کے کلچر کی عکاسی کی گئی ہے۔ آصف کے افسانوں کا آخری مجموعہ "میرے دن گزر رہے ہیں" اپنے عنوان سے ہی ظاہر کرتا ہے کہ اس میں ایسے افسانے شامل کیے گئے ہیں جن میں زندگی کی حقیقت اور سچائی کو بیان کیا گیا ہے۔ان افسانوں میں بنیادی طور پر ان شب وروز کے حالات وواقعات کو بیان کیا گیا ہے جو راوی کو روزمرہ زندگی میں درپیش ہیں۔ جن میں وہ اپنی زندگی بسر کر رہا ہے اور سماجی اور مذہبی گھٹن کے باوجود ان حالات میں اپنی زندگی کے دن گزارنے پر مجبور ہے۔اس مجموعے میں شامل تمام تر افسانے اسی ماحول اور انہی حالات کے پیدا کردہ ہیں جو افسانہ نگار نے دیکھے اور محسوس کئے۔ اسی طرح کا ایک افسانہ

"بن کے" بھی ہے جو کہ آصف فرخی نے اس مجموعہ کے چھپنے کے بعد میں تحریر کیا۔ آپ کا یہ افسانہ آپ کے افسانوں کے مجموعے "سمندر کی چوری" میں شامل ہے۔ اس افسانے میں پاکستان کی موجودہ صورتحال کو بہت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

آصف فرخی کی افسانہ نگاری کو اگر مجموعی طور پر اس کے فکری مزاج کے تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو ہمیں معلوم ہو گا ان کا فکری مزاج فرد اور معاشرے کے بے شمار موضوعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ مشہور افسانہ نگار غلام عباس نے آصف فرخی کے پہلے مجموعے "آتش فشاں پر کھلے گلاب" کے فلیپ پر آصف فرخی کی افسانوی فکر کے حوالے سے جو امید باندھی تھی وہ آج روز روشن کی طرح ہمارے سامنے موجود ہے۔ غلام عباس کے مطابق

> "آصف فرخی کی افسانہ نگاری کی عمر ابھی چھوٹی ہے یہی کوئی چار سال یا پانچ سال مگر اس کم عمری کے باوجود انہوں نے افسانہ نگاروں کی صف اول میں اپنی جگہ بنالی ہے ان کی فکر میں تنوع ہے اور مشاہدے میں حقیقت پسندی ان کا ہر افسانہ ایک نئے تجربے کا حامل ہوتا ہے اور افسانہ ان کے ہاتھوں جلد ہی ترقی کی نئی منازل طے کرلے گا۔"[۱۵]

آصف فرخی کے افسانوں کا ایک بڑا موضوع فرد کی مجبوریوں اور اپنے خارجی اور داخلی حالات کے سامنے اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود بے بسی ہے۔ "ڈرائے گئے شہر کے باطن"، "صلاۃ الخوف"۔ "اس میں ظالم بوئے خوں کی راہ ہے۔" اسکی بہترین مثال ہیں جس میں فرد اپنے ارد گرد کے حالات سے نفرت کرنے کے باوجود اس سے بغاوت نہیں کر سکتا اور حالات کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہے وہ ایک ایسے ماحول کا شکار ہے جہاں مذہبی تہوار بھی آزادی سے منائے نہیں جاسکتے۔ مسجدوں نے میدانِ جنگ کا روپ دھار لیا ہے۔ جہاں موت ہر طرف اپنے پنجے گاڑھ چکی ہے اور افراد معاشرہ کسی رہنما کی تلاش میں ہیں۔ افسانوی مجموعے "اسم اعظم کی تلاش" میں شامل افسانے "پیچھے دیکھا اور پتھر" میں افسانہ نگار معاشرتی زوال کو بیان کرتے ہیں۔ اس افسانے میں اس ترقی یافتہ معاشرے کے منہ پر طمانچہ لگایا گیا ہے جس نے ترقی کے نام پر افراد کو ایسے مسائل سے دوچار کر دیا ہے کہ انسانیت زوال پذیر ہو گئی ہے اور معاشرہ قوم لوط کی برائی میں مبتلا ہو گیا ہے اگر اب بھی ان برائیوں پر قابو نہ پایا گیا تو ہمارا حال بھی وہی ہو گا جو قوم لوط کا ہوا تھا۔ آصف فرخی کے اسی مجموعے کے ایک اور افسانے "یزید کی پیاس" میں آپ معاشرے کی خارجی صورتحال کے ساتھ ساتھ فرد کی داخلی کیفیات کو بھی فکری سطح پر بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ اگر کوئی فرد معاشرے میں کوئی

تعمیری اور مثبت کام کرے تو ہمارا معاشرہ اس کی نیکی اور مثبت سوچ کو اس کے لئے وبالِ جان بنا دیتا ہے اور وہ خود ہی مزاحمت بن جاتا ہے۔ اس افسانے میں فرد کی زندگی کے ایک ایسے ہی واقعے کو بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے حوالے سے نیرّ مسعود کہتے ہیں کہ

> "کہانی پڑھ کر خاص طور پر غلام عباس یاد آئے وہ ہے صورتحال کا رفتہ رفتہ بدلتے بدلتے بالکل تبدیل ہو جانا کہ جس آدمی نے بیچارے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پانی پلانے کے لئے کولر رکھ دیا تھا وہ آخر کار یزید کہلایا اور کوئی ڈرامائی موڑ اس افسانے میں نہیں ،اپنے آپ بہتا چلا جا رہا ہے تو یہ چیز اس میں خاص تھی جس کی وجہ سے ہم سب کو غلام عباس یاد آئے۔"[۱۶]

آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں ان تمام مسائل کو اجاگر کیا ہے جو ہمارے معاشرے میں سرایت کر چکے ہیں اور معاشرے میں رہنے والا ہر فرد ان مسائل سے بُری طرح دوچار ہے۔ آپ کے افسانوں میں نہ صرف ہمیں حقیقی اور مقامی زندگی کی صورت گری نظر آتی ہے بلکہ وہ گھریلو زندگی اس میں موجود افراد کے ساتھ محبت کے تعلق کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ باپ اور بیٹی کے رشتے اور ان کے مابین محبت کو وہ اپنے افسانے "لکڑی والا" اور "مینا کی گنتی" میں بیان کرتے ہیں وہ بیٹی کو مینا سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح مینا اگر اڑ جائے تو گھر کی منڈیر کو اداس کر جاتی ہے۔ اسی طرح جب بیٹیاں گھر سے بیاہ کر رخصت ہو جائیں تو وہ گھر بھی گہری اداسی میں ڈوب جاتا ہے۔ آصف فرخی ایسے افسانہ نگار ہیں جو قرآن کے واقعات، داستانوں اور عہد ناموں سے بھرپور استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ان داستانوں اور حکایات کا تانا بانا عہد حاضر کے موجودہ مسائل سے جوڑتے ہیں۔ اپنے افسانے "اصحاب کہف" اور "حقایت نیند سے واپس آنے والوں کی" میں موجودہ عہد کے انسان کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے جن کا شکار انسان اپنی زندگی کو بے معنی اور کھوکھلا تصور کرتا ہے۔ اس کے لیے زندگی بے رنگ اور خالی ہے۔ اس میں وہ اپنے لئے کوئی کشش محسوس نہیں کرتا وہ اس زندگی کو جی نہیں رہا بلکہ اس کو جھیل رہا ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک اور موضوع فرد کی شناخت بھی ہے۔ وہ اپنے افسانے "جشن مرگ انبوہ" جو ان کے مجموعے "اسم اعظم کی تلاش" میں شامل ہے میں بتاتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کا فرد اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش تو کرتا ہے مگر وہ شخصی اوصاف سے محرومی کے باعث معاشرے میں اپنا اصل مقام حاصل نہیں کر پاتا کیونکہ وہ اپنے ماضی کو فراموش کر کے اس سے کٹتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنی اصل پہچان اور شناخت کھو دی ہے۔ ہمارا معاشرہ اپنی اقدار کو بھلا بیٹھا ہے اور

خود غرضی کے مجسمے بن گیا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ اپنی قیمتی اخلاقی اقدار کھو کر زبوں حالی کا شکار ہو گیا ہے۔ افسانہ " آٹے کی آپا" اور "کنچا" میں آصف فرخی نے جنس کے موضوع پر بات کی ہے۔ یہ افسانے جنس کے موضوع کے حوالے سے سے لکھے جانے والے بہترین افسانے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنے افسانوں میں نئی نسل کے نئے طور اطوار کو اپنانے کی وجہ سے پرانی تہذیب کے مٹنے کے المیے کو بھی موضوع بنایا ہے کہ کس طرح پرانی تہذیب اور روایات دم توڑ گئے ہیں۔ جبکہ نئی تہذیب کا جادو ہر چھوٹے بڑے کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانے "نانو ہاؤس"، "ویلنٹائن" اور "شیطانی چرخہ" اہم ہیں۔ اس حوالے سے عرفان جاوید کہتے ہیں کہ

> " شیطان کا چرخہ، دادی بی کا کردار اور ان سے منسلک لوارم ٹین کا بکسا، دو پوٹلیاں ، طوطے کا پنجرہ، ہاتھ سے جھلنے کا پنکھا، لوٹا اور تانبے کے برتن، ایک مخصوص تہذیب کی واضح علامت بن کر قاری کے پردہ شعور پر آیت آیت اترتے ہیں۔"[۱۷]

مختصر یہ کہ اگر آصف فرخی کے افسانوں کا موضوعاتی حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ ان کے افسانوں میں موضوعات کی متنوع جہات ملتی ہیں۔ انہوں نے زندگی کو کسی ایک رخ یا نظریے سے نہیں دیکھا بلکہ زندگی کے ہر زاویے کو نہ صرف دیکھا بلکہ اسے جانچ اور پرکھ کر اپنے افسانوں میں جگہ بھی دی ہے۔ معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے ہر نئے منظر نامے، معاشرتی آویزش سے پیدا ہونے والی ہر رکاوٹ اور مشکل ان کے افسانوں میں جنم لیتی نظر آتی ہے۔ اسی طرح اگر آصف فرخی کے افسانوں کا فنی طور پر جائزہ لیا جائے تو ان کے افسانوں کی ترتیب اور واقعات کے اعتبار سے مختلف پلاٹ کی قسمیں نظر آتی ہیں۔ ان کے کچھ افسانے سیدھے سادے پلاٹ پر مبنی ہیں، کچھ پیچیدہ اور کچھ افسانے غیر پلاٹ پر مبنی ہیں۔ ان کے افسانے دفینہ، یادوں کے پردیس، چیل گاڑی، شیطانی چرخہ، مینا کی گنتی اور افسانوی مجموعے شہر ماجرا اور شہر بیتی میں شامل بہت سے افسانے سادہ پلاٹ کے حامل ہیں ان میں ایک ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے اور ان افسانوں میں موجود کہانیوں کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ان کے افسانوی مجموعے "چیزیں اور لوگ" میں شامل بہت سے افسانے جن میں "من شر ما خلق" اور "آتش فشاں پر کھلے گلاب" میں شامل ہیرے جیسی کہانی، آتش فشاں پر ناچنے والا چوہا، ناقۃ اللہ، بوڑھ کہانی اور ختم کہانی جبکہ افسانوی مجموعے "میرے دن گزر رہے ہیں" میں شامل افسانہ "کہر" پیچیدہ پلاٹ کے حامل افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان افسانوں میں

شامل واقعات پیچیدگی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں افسانے کے آغاز میں اس کا انجام بیان کرنے کے بعد باقی کے پورے افسانے میں اس انجام کی گتھیوں کو سلجھایا جاتا ہے۔ آصف فرخی کی پلاٹ نگاری کے حوالے سے قمر احسن کہتے ہیں کہ

"آصف فرخی کو کہانی پیش کرنے کا سلیقہ ہے اور بڑا اعتماد بھی اسی لیے وہ کمزور افسانے اور غیر ضروری صورتحال کو بھی اپنے ٹھہرے ہوئے لیکن نمو پذیر بیانیے کے ذریعے بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔"[۱۸]

آپ کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی آپ کی علامت نگاری ہے۔ آپ علامتی انداز میں ماضی میں پیش آئے واقعات اور قصوں کو صورتحال کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ جس سے قاری کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم ہوتا ہے۔

آصف فرخی کے افسانوں میں کردار نگاری میں تنوع نظر نہیں آتا مگر اس کے باوجود ان کے کردار اپنی کہانی میں زندہ نظر آتے ہیں چاہے ان کا تعلق حقیقی زندگی سے ہو یا ماورائے حقیقت سے۔ آپ کے افسانوں میں اکثر و بیشتر راوی خود ہی کردار کے طور پر نمودار ہو جاتا ہے اور واقعات کو بیان کرنے لگتا ہے۔ مرد افسانہ نگار ہونے کے باوجود آپ نے اپنے افسانوں میں عورت کے کردار کو بھی بڑی مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ آپ کے بہت سے افسانوں میں عورت کا کردار مرد کے کردار پر سبقت بھی رکھتا ہے۔ اس کی مثال آپ کا افسانہ "قلزم" ہے جس میں ایک کمزور اور بزدل مرد کے کردار کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، یہ مرد کردار حقیقت سے اس قدر خوفزدہ ہے کہ ایک اور وجود کا خوف اسے سچ کا سامنا کرنے سے ڈراتا ہے۔

"میں یہ کیوں بھول گیا تھا کہ ایک لمس آئندہ کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے آئندہ، جس کا مطلب ہے ایک اور وابستگی ایک اور وجود۔ یہ خیال اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑا دینے کے لئے کافی تھا۔"[۱۹]

جبکہ اس کے برعکس اس افسانے میں موجود عورت کا کردار انتہائی مضبوط ہے جو اپنے خیالات و جذبات کا اظہار بھی کرنا جانتی ہے اور سچ کا سامنا کرنے سے بھی نہیں گھبراتی۔ جیسا کہ آصف فرخی کا تعلق میڈیکل کے شعبے ڈاکٹری کے پیشے سے ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی پیشہ ورانہ مہارت اور قابلیت ان کی تخلیقات میں بھی دیکھنے کو ملتی

ہیں۔ ان کے افسانے گوہائی، ناف، کیلشیم، الرجی، کھجلی اور پھپھوندی اس بات کا ثبوت ہیں کہ آصف فرخی نے معاشرے کو ایک سرجن کے طور پر دیکھا اور باریک بینی سے اس کے مسائل کا مشاہدہ کیا۔ معاشرے کے وہ افراد جو کھجلی کا شکار ہیں یا انہیں فنگس لگ چکی ہے معاشرہ کو اس سے الرجی ہے اور وہ گوہائی کی طرح انھیں تکلیف دیتے ہیں۔ اس سب کے باوجود ان پر یہ احساس بھی غالب رہتا ہے کہ وہ ہمارے جسم کا حصہ ہیں۔ وہ فنگس والا ناخن ہو یا آنکھ پر نکلنے والی گوہائی، جسمانی طور پر لنگڑا یا ٹنڈا ہو یا کیلشیم کی کمی کی وجہ سے اس کے بھر بھرے اور ٹوٹے دانت اس کے چہرے کو ایک مکمل خوبصورت مسکراہٹ نہیں دے سکتے ہوں، اس کے باوجود انہیں اپنے جسم سے کیسے الگ کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام افسانوں میں کہیں بھی ان عیب زدہ عضو کو اپنے جسم سے کاٹ پھینکنے کا احساس نہیں ملتا۔ افسانہ نگار کو اپنا فنگس زدہ ناخن بھی عزیز ہے اور وہ ناکارہ عضو بھی جواب کسی کام کا نہیں رہا۔

آصف فرخی کے افسانوی مجموعے "ایک آدمی کی کمی" میں سندھی تہذیب اور اس کی مٹی کی خوشبو موجود ہے۔ اس مختصر افسانوی مجموعے میں دو تین افسانے ایسے ہیں جو اپنی پہچان آپ ہیں اور اس طرح کے افسانے پہلے دیکھنے کو نہیں ملے۔ اس مجموعے کے حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

> "سندھی فوک کلچر اور استوری روایتوں سے بھی آصف فرخی نے خوب استفادہ کیا۔ "ایک آدمی کی کمی" میں شامل کہانیاں "ہنس پکھی"، "پاڈا" اور "واچوڑے کی واٹ" اس سلسلے میں نمایاں ہیں۔"[۲۰]

آصف فرخی کے ان افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر کس قدر حساس طبیعت رکھتے ہیں۔ ان کے بہت سے افسانوں میں میڈیکل آلات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ آپ اگر اتنے حساس اور باریک بین افسانہ نگار نہ ہوتے تو یقینا ایک ماہر سرجن ہوتے۔ آپ کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے عہد کے آشوب کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ جدید دور کے انسان کے سماجی اور ذہنی رویوں اور مسائل کو اجاگر کیا اور نہ صرف یہ بلکہ اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی ماحول کو تاریخی و تہذیبی تسلسل کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا۔ فرد کے ظاہری اور باطنی خلا کو محسوس کیا، معاشرتی بے حسی پر روشنی ڈالی، کراچی کے ہلاکت آفریں ماحول، ڈری سہمی فضاؤں، انجان اندیشوں اور بے یقینی کی صورتحال کی سچی تصویر کھینچ کر اپنے افسانوں کے ذریعے ہمارے سامنے رکھ دی۔ آصف فرخی اپنے افسانوں میں بھیس بدل بدل کر کبھی ماضی میں جھانکتے

نظر آتے ہیں تو کبھی حال کے منظر نامے پر غور کرتے دکھائی دیتے ہیں اور پھر زندگی کے ان تمام رنگوں اور مناظر کو یکجا کر کے اپنے افسانوں میں دکھاتے نظر آتے ہیں۔

د۔ اردو افسانے کی روایت اور کراچی

جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے کہا جاتا ہے کہ اس وقت سے اس دنیا میں بسنے والے انسانوں میں کہانی سننے اور سنانے کا مشغلہ مقبول و محبوب جانا گیا ہے۔ پہلے پہل جب یہ دنیا صنعتی و مادی ترقی سے آشنا نہیں ہوئی تھی وسائل اور سہولیات کی کمی کے باعث لوگ فارغ اوقات میں ایک دوسرے کو مختلف قصے اور کہانیاں سناتے تھے جنہیں داستان بھی کہا جاتا تھا۔ لوگ دور دراز سے داستان سننے کے لئے داستان گو کے پاس آتے۔ یہ داستانیں ہفتوں، مہینوں تک جاری رہتی تھیں۔ یہ داستانیں زیادہ تر مافوق الفطرت کرداروں، تہذیب و ثقافت اور حسن و عشق کے قصوں پر مبنی ہوتی تھیں۔ آہستہ آہستہ وقت نے کروٹ بدلی جس طرح برصغیر کی انسانی زندگی میں اور بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں اسی طرح داستان کی جگہ ناول نے لے لی۔ "ڈپٹی نذیر احمد" نے اصلاحی ناول لکھ کر اردو ادب میں ناول نگاری کا آغاز کیا۔ ناولوں میں کسی انسان کی پوری زندگی کے واقعات کو بیان کیا جاتا تھا۔ ناول میں کہانی مافوق الفطرت کرداروں کی بجائے زیادہ تر حقیقی زندگی سے تعلق رکھنے والے کرداروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ناول نگاری کے بعد دنیا میں صنعتی انقلاب نے جہاں معاشرے میں اور بہت سی تبدیلیاں اور پیچیدگیاں پیدا کیں وہیں اس نے افسانے کو بھی جنم دیا۔

افسانہ جدید دور کے انسان کی ضرورت اور ایجاد ہے۔ اردو ادب کی دوسری اصناف کی طرح افسانہ نگاری کا فن بھی مغرب سے اردو زبان میں آیا۔ صنعتی انقلاب نے انسانی زندگی کو مصروف کر دیا تھا۔ ایسے میں قاری کو کسی ایسے فن پارے کی ضرورت پیش آئی جس کو کم وقت میں پڑھ کر لطف اندوز ہو سکے۔ ایسے میں افسانہ وہ ادب پارہ تھا جو مصروف انسانی زندگی میں کسی نعمت سے کم ثابت نہ ہوا۔ مختصر افسانے کی تعریف کرتے ہوئے سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ

> "افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا کسی ایک واقعہ، ایک جذبے، ایک احساس، ایک تاثر ایک اصلاحی مقصد، ایک روحانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو افسانے کی امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے

داستان اور ناول سے الگ کیا۔ مختصر افسانے میں اختصاراورایجاد کی دوسری امتیازی خصوصیت نے اس کے فن میں سادگی، حسن ترتیب وتوازن کی ضرورت پیدا کی۔"[۲۱]

اس تعریف کی روشنی میں اگر یہ کہا جائے کہ افسانہ وہ مختصر کہانی ہے جس میں زندگی کے کسی ایک واقعہ، کسی ایک منظر یا شخصیت کی کسی ایک ادا کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ وحدت تاثر اس کا خاصہ ہوتا ہے اور اسے ایک ہی نشست میں بیٹھ کر با آسانی پڑھا جاسکتا ہے۔

برصغیر پاک وہند میں باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا۔ اردو افسانے کے آغاز میں ہی دو تخلیقی رجحان دیکھنے کو ملے۔ پہلا تخلیقی رجحان تخیلی تھا۔ اس رجحان کے زیر اثر لکھنے والے افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، احمد نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، ل احمد اور بہت سے دیگر افسانہ نگار شامل ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں حقیقت نگاری کی بہ نسبت تخیل آفرینی اور رومانس کو زیادہ شدت سے محسوس کیا گیا۔ یہ افسانہ نگار حقیقی دنیا سے دور تخیلاتی فضامیں سانس لے رہے تھے اوراسی دنیامیں عشق و محبت اور حسن کے غیر حقیقی تصور کو بیان کرنے میں مصروف عمل تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان افسانہ نگاروں کے یہاں کردار نگاری نہ ہونے کے برابر ہے، انہوں نے ماحول کی ہر کروٹ اور رجحان کو علامت سے واضح کیا۔ اسی لئے انہوں نے کردار کے بجائے مثالی نمونوں کی پیشکش کی یہاں تک کہ انسانی قدروں مثلاً محبت، حسن، سچائی کو بھی علامت سے اجاگر کیا گیا۔ اس سب کے باوجود ان افسانہ نگاروں نے بعض معرکے کے افسانے بھی لکھے لیکن بعض اوقات افسانوں میں تخیلاتی فضا کی شدت کے باعث افسانہ نگار زندگی کی عام سطح سے اپنا رشتہ مضبوط نہ کر سکا۔

اردو افسانے کے پہلے دور کا دوسرا رجحان حقیقت پسندی کا تھا۔ اس رجحان کے تحت لکھنے والوں میں سب سے اہم اور پہلا نام "پریم چند" کا ہے۔ پریم چند نے اپنی زمینی حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھا اور زندگی کے ارضی پہلوؤں اور سماج میں موجود مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کے افسانوں میں کردار پہلی مرتبہ پوری طرح ابھر کر سامنے نظر آتے ہیں۔ پریم چند کی افسانہ نگاری نے حقیقت پسندی کے رجحان کے تحت زندگی کو دوسرے افسانہ نگاروں (تخیلاتی) کی نسبت زیادہ قریب سے دیکھا ہے اور زندگی کی اصل تصویر سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے پریم چند کو اردو افسانے کے معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اردو افسانے کے دوسرے دور کا آغاز تقریباً ۱۹۳۶ء میں ہوا اور بعض ناقدین کے مطابق "انگارے" کی اشاعت سے قبل ہی اس نئے دور کے نقش واضح ہو گئے تھے اور پاک وہند میں جاری آزادی کی تحریک، مغربی ادب کے اثرات اور معاشرے میں پھیلی ہلچل نے اس دور کی ابتدا کی۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اس سے پہلے ۱۹۲۹ء کے اقتصادی بحران اور دوسری جنگ عظیم نے افسانے کو تخیل محض کی فضا سے نکال کر سیاسی، سماجی اور نفسیاتی موضوعات سے قریب کر دیا تھا اور اگر دیکھا جائے تو دوسرے دور میں بھی افسانے کے وہ دونوں رجحان تخیلی اور حقیقی قائم رہے جو پہلے دور کا طرہ امتیاز تھے۔ بس فرق اتنا آ گیا تھا کہ تخیلی رجحان نے اپنی صورت بدل لی تھی اور اس میں تخیل کو سماجی کروٹوں اور زمینی مسائل کو پرکھنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ یہ رجحان اس دور کے سب سے بڑے بڑے افسانہ نگار کرشن چندر کے ہاں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملا۔ اس نے افسانے کو تخیل محض کی فضا سے نکال کر اس سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہوئے زندگی اور معاشرے میں جاری ہلچل پر گہری نظر ڈالی۔ کرشن چندر نے اپنے اور ہلچل مچاتی کروٹیں بدلتی زندگی کے درمیان ایک قدم کا فاصلہ قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے افسانوں میں کردار کی بجائے۔ کسان، پٹواری، سپاہی، بھنگی، محرر اور لالہ جیسے مثالی نمونے پیش کیے۔ نتیجتاً تخیل اور حقیقت کا وہ امتزاج دیکھنے کو نہیں ملا جو ادب عالیہ کی تخلیق کے لیے ضروری تھا۔ اس سب کے باوجود اردو افسانے میں کرشن چندر کی عظمت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اردو افسانے کے دوسرے دور میں تخیلی رجحان کے ساتھ حقیقت پسندی کا رجحان ملتا ہے لیکن یہاں افسانہ نگار نے حقیقت پسندی کے رجحان کے تحت زندگی کو پریم چند کی نسبت زیادہ قریب سے دیکھا ہے اور زندگی کی اصل تصویر سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس رجحان کے تحت لکھنے والوں نے کردار کی زندگی میں غوطہ لگا کر اس میں موجود زخموں اور داغوں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ اس رجحان کے علمبردار افسانہ نگاروں میں منٹو، بیدی، احمد علی، عصمت چغتائی اور اختر اورینوی جیسے دوسرے افسانہ نگار شامل ہیں۔ اس دور میں زندگی کی بالائی سطح کو افسانوں میں پیش کرنے میں حقیقت نگاری کا رجحان عروج پر نظر آیا اور زندگی کی تلخ حقیقتیں کھل کر آئینے کی طرح سامنے آ گئیں۔ ایسے میں بہت سے فنکار حقیقت کو بیان کرنے میں اس قدر محو ہو گئے کہ انہوں نے فن کے تقاضوں سے منہ موڑ لیا۔ جبکہ فن کا تقاضا تو یہ ہے کہ حقیقت کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ سپاٹ اور بے رنگ ہو کر لطافت اور رعنائی سے محروم نہ ہو، لیکن جب ایسا نہ کیا جائے اور فن کے تقاضے کو نظر انداز کیا جائے تو یہ عمل بجائے خود ایک شعوری کاوش کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس سلسلے میں اختر اورینوی اور بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں کے نام شامل ہیں۔ ایسے میں

"منٹو" نے حقیقت نگاری کی روش پر چلنے کے باوجود اپنا دامن سپاٹ پن سے بچائے رکھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ منٹو نے اپنے لئے ایک ایسا میدان منتخب کیا جو ایک عام قاری کے لیے بے حد دلچسپ تھا۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں کردار کے جنسی پہلو کو منفرد انداز میں اجاگر کیا۔ زندگی کے ایک محدود پہلو کو اپنے لیے منتخب کر کے خلوص، دیانت اور گہری نظر کا ثبوت دیا جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس حوالے سے وزیر آغا کہتے ہیں کہ

> " قاری کو منٹو کے افسانے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے نڈر اور بے باک شخص سے کہانی سن رہا ہے جس نے بہت سے پردے نوچ کر الگ کر دیئے ہیں تاہم یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ شخص انکشاف و عرفان کے مراحل سے بھی آشنا ہے اور زندگی کی مخفی کروٹوں کا نباض بھی ہے۔ "[۲۲]

اردو افسانے کے دوسرے دور میں حقیقت پسندی کے علاوہ نفسیاتی مطالعے کی روش نے بھی فروغ پایا۔ اس رجحان کے تحت لکھنے والے افسانہ نگار کردار کے نفس لاشعور میں غوطہ زن ہو کر اس میں چھپے ہوئے رازوں سے پردہ اٹھاتے تھے اور اسے بھی حقیقت نگاری ہی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کیونکہ افسانہ نگار کردار کے لاشعور میں چھپے ہوئے پہلوؤں کا تجزیہ کر کے قاری کے سامنے پیش کرتا تھا۔ کردار کہ نفسیاتی مطالعے کے بھی اردو افسانے میں دو رجحان دیکھنے کو ملے۔ ان میں سے ایک رجحان جس کے علمبردار "حسن عسکری" تھے سپاٹ پن کی حد تک حقیقت پسندی کو فروغ دے رہا تھا۔ حسن عسکری نے انسانی سوچ اور تلازمہ خیال کا طریقہ کار اختیار کیا اور حقیقت نگاری کے مقصد کو سامنے رکھ کر کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا جس سے افسانہ ضرورت سے زیادہ بوجھل اور سپاٹ بن گیا۔ جس کے نتیجے میں افسانے سے جمالیاتی عناصر کم پڑ گئے اور قاری کی دلچسپی قائم نہ رہ سکی۔ حسن عسکری نے اردو افسانہ کو ایک نئے رجحان سے متعارف تو کروایا اس لئے اس کی ایک خاص اہمیت بھی ہے مگر ان کے افسانوں میں لطافت اور رعنائی کی وہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکی جو کہ بہترین فن پارے کی امتیازی صفت ہے۔ اردو افسانے کے دوسرے دور میں نفسیاتی مطالعے کا ایک اور رجحان بھی دیکھنے کو ملا جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس رجحان کے علمبردار "ممتاز مفتی" تھے۔ "ممتاز مفتی" نے اپنے افسانوں میں نہ صرف کردار کی شخصیت میں چھپے ہوئے پہلوؤں کو اجاگر کیا بلکہ انسانی زندگی میں موجود بہت سی الجھنوں پر بھی روشنی ڈالی اور کردار کی تعمیر میں بھی نظر کی کشادگی اور رفعت کو مد نظر رکھا۔ "ممتاز مفتی" نے افسانوں میں کرداروں کا حقیقت پسندانہ تجزیہ تو کیا مگر اس سے افسانے کو سپاٹ پن کا شکار نہیں ہونے دیا۔ یہی

وجہ ہے کہ "ممتاز مفتی" کے افسانے پڑھتے ہوئے قاری عدم دلچسپی کا شکار ہوئے بغیر ان میں محو ہو کر ان کا مطالعہ کرتا ہے۔

اردو افسانے کے دوسرے دور میں تین طرح کے رجحان دیکھنے کو ملے جن میں ایک ارضی تخیلی، دوسرا حقیقت نگاری اور تیسرا نفسیاتی مطالعے کا تھا۔ نفسیاتی مطالعے کا یہ رجحان پہلے دونوں رجحانات کے امتزاج سے وجود میں آیا اور یہ رجحان اس سے پہلے دور میں نہیں دیکھا گیا۔ اس رجحان کے تحت لکھنے والے افسانہ نگاروں نے انسانی زندگی اور اس کے مسائل کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کا گہرا مشاہدہ کیا مگر ایک کمی جو اس دور کے افسانے میں دیکھنے کو ملی، وہ یہ ہے کہ اس دور کے افسانے نے اپنے اندر بہت سے موضوعات کو سمیٹا لیکن ہندوستان کی تقسیم جیسے بڑے اور اہم واقعات کو نظر انداز کر دیا۔ اس دور کے افسانے میں ہمیں ترقی پسند تحریک کے تحت انسان دوستی، ظلم و جبر کے خلاف احتجاج، غربت و مفلسی جیسے مسائل کی تصویر کشی تو ملتی ہے مگر کہیں بھی قومیت کا تصور ابھر کر سامنے آتا دکھائی نہیں دیتا۔ ڈاکٹر انوار اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ

> "اردو افسانے کے مطالعے نے اکثر مجھے ایک سوال پر خوب الجھایا وہ یہ کہ وہ کینوس جس پر سیاسی ارتعاش کی ہر لہر کا نقش ابھرا ہے تحریک پاکستان کا مظہر کیوں نہ بن سکا؟ بلاشبہ ایسے افسانے ضرور لکھے گئے جس میں خلافت کے حوالے سے جداگانہ مسلم شخصیت کا احساس ابھرتا ہے یا کہیں کہیں قائداعظم یا مسلم لیگ کا سرسری حوالہ بھی آیا ہے مگر کروڑوں مسلمانوں کی دلوں کی دھڑکن اردو افسانے میں کیوں نہ سنائی دی۔"[۲۳]

۱۹۴۷ء میں برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اردو افسانے کے تیسرے دور کا آغاز ہو گیا۔ بدقسمتی سے برصغیر پاک و ہند کے رہنے والوں کو اس آزادی کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑی۔ اس آزادی کے بدلے بہت سے انسانوں کا خون بہا، لاکھوں بچے یتیم ہوئے، لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے، لاکھوں خواتین کی عصمتیں لٹیں صرف یہی نہیں بلکہ لاکھوں خاندانوں کو اپنی سرزمین، گھربار چھوڑ کر ہجرت بھی کرنا پڑی۔ آزادی کی اس ہنگامہ خیز صورتحال کے بعد بہت عرصے تک اردو افسانے میں آزادی کے نتیجے میں ہونے والے فسادات کو موضوع بنایا گیا۔ اس دور میں لکھنے والے افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب، حیات اللہ انصاری، رحمان مذنب، جیلانی بانو، قرات العین حیدر، خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی، صادق حسین، بلراج کومل، یونس جاوید اور ہاجرہ مسرور کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔

برصغیر پاک وہند کی آزادی کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت کا مسئلہ بھی وابستہ تھا مگر فسادات کے مسئلے تلے یہ بحث اس وقت وقتی طور پر دب گئی اور کچھ عرصے بعد ہجرت کو موضوع بنا کر اُن پر افسانے لکھے گئے۔ ہجرت کے موضوع پر لکھنے والوں میں قرۃالعین حیدر، انتظار حسین اور احمد ندیم قاسمی کے نام نمایاں ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل اختر محبی کہتے ہیں کہ

> "تقسیم ہند نے یوں تو بہت سارے مسائل کو جنم دیا لیکن دو مسئلے ایسے تھے جن سے افسانہ نگار زیادہ متاثر ہوئے اول فسادات کا مسئلہ اور دوم سرحد عبور کرتے ہوئے لوگوں کا کرب۔ اردو افسانہ نے دونوں موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹا۔"[۲۴]

برصغیر کی آزادی کے بعد ترقی پسند اور سماجی حقیقت نگاری کے تحت لکھا جانے والا افسانہ زوال کا شکار ہو گیا اور ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آس پاس جدیدیت کی تحریک شروع ہو گئی۔ یہ عشرہ جدید افسانے کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس عشرے نے اردو افسانے میں ایک نیا رخ متعین کیا جس کے تحت علامتی اور تجریدی افسانے لکھے جانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ علامتی افسانہ نگاری کے آغاز کی ایک وجہ پیش رو افسانے کی حد سے بڑھی ہوئی خارجیت، بلند آہنگی اور یکسانیت کے خلاف احتجاج تھا جس نے داخلیت اور دھیمے لہجے کو عام کیا۔ پاکستان میں علامتی افسانے کے آغاز میں انتظار حسین اور انور سجاد اور ہندوستان میں سریندر پرکاش اور بلراج کومل کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی بنگال سازشوں اور جنگ کے نتیجے میں پاکستان سے الگ ہو گیا، اس سب صورتحال میں فوجیوں کے علاوہ مکتی باہنی کے ہاتھوں لاکھوں شہریوں کا قتل عام ہوا جن میں زیادہ تعداد مغربی پاکستانیوں اور مشرقی پاکستان میں آباد غیر بنگالیوں کی تھی۔ ان تمام حالات وواقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستان، بنگلہ دیش اور پاکستان میں بہت سے افسانے لکھے گئے اور یہ بات دیکھنے میں آئی کہ ایک ہی موضوع پر لکھے جانے والے افسانے میں تین ممالک کا نقطہ نظر مختلف تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ افسانہ نگاروں میں قومیت کے فرق نے جنم لے لیا تھا جبکہ اس سے پہلے تقسیم ہند پر لکھے جانے والے افسانوں میں یہ فرق نہ دیکھا گیا تھا۔

ابھی پہلے ہی مسائل حل نہ ہوئے تھے کہ ۱۹۷۷ء میں ایک بار پھر پاکستان میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے منتخب عوامی و آئینی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا تختہ الٹا کر اس پر قابض ہو گئے، نہ صرف یہ بلکہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی بھی دے دی گئی جسے عدالتی قتل کہا گیا۔ پاکستانی افسانہ نگاروں پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور انہوں نے سخت پابندیوں کے باوجود اس واقعے پر افسانے تحریر کیے۔ اس واقعہ پر رد عمل کے طور پر

افسانے تحریر کرنے والوں میں رشید امجد، اے خیام، مسعود اشعر، منشایاد، اعجاز راہی اوراحمد داود کے نام اہم ہیں۔اعجاز راہی نے نہ صرف مارشل لاء کے خلاف افسانے لکھے بلکہ ایک افسانوی مجموعہ "گواہی" کے نام سے بھی شائع کیا جس کے نتیجے میں انہیں اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے۔اسی طرح بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی مارشل لاء دور میں مصائب اور مشکلات کا سامنا کیا۔

۸۰ء کی دہائی کو پاکستان کے لیے سیاسی ابتری کا زمانہ کہا گیا ہے۔اسے مزاحمتی ادب کی دہائی بھی کہا جاتا ہے۔ عام طور پر مزاحمت ہر دور میں ادب کا حصہ رہی ہے۔ادیب ہمیشہ ظلم و جبر کے خلاف اپنی تخلیق کے ذریعے آواز اٹھاتے رہے لیکن ۱۹۸۰ء کے عشرے میں مزاحمت سیاسی ظلم و جبر کے خلاف عوامی رد عمل کی حیثیت اختیار کر گئی۔سیاسی ہلچل کو روکنے کے لیے مذہبی تشدد اور گروہ بندی کو با قاعدہ طور پر فروغ دیا گیا اور پاکستانی معاشرے کو ایک ایسے معاشرے میں تبدیل کر دیا گیا جس کے سارے دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان ایک ایک کر کے بند کر دیئے گئے تا کہ کسی طرح سے بھی کوئی کھل کر سانس نہ لے سکے۔اس دور میں جتنا بھی ادب تخلیق کیا گیا اس کا زیادہ تر موضوع مارشل لاء اور ظلم و جبر کے خلاف عوامی اظہار خیال تھا۔

پاکستان میں ۸۰ء اور ۹۰ء کی دہائی میں اردو افسانے نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی جس کے نتیجے میں ترقی پسند، سماجی حقیقت نگاری، اور تجریدی و علامتی افسانے سے ہٹ کر مختلف قسم کے افسانے لکھے جانے لگے۔اس عرصے میں نا صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں افسانے کی تخلیق کا رجحان بڑھا۔برطانیہ، امریکہ، خلیجی اور دوسرے کئی ممالک میں رہائش پذیر یا روزگار کی تلاش میں جانے والے افسانہ نگاروں نے بھی افسانے تخلیق کیے۔ان میں سے زیادہ تر افسانہ نگاروں کا موضوع ہجرت اور وطن سے دوری تھا جبکہ چند کا موضوع وہاں کے مقامی مسائل اور عالمی صورتحال میں ہونے والی تبدیلیاں بھی تھا جس سے افسانے میں نئے موضوعات نے جگہ بنائی۔

اردو افسانے میں اسی کی دہائی اپنے ساتھ خوف و دہشت، قتل و غارت، تنہائی، بے اعتمادی، داخلی اور خارجی ٹوٹ پھوٹ، شکست وریخت اور وجود کے معدوم ہو جانے کے احساسات کی تند و تیز لہریں اپنے ساتھ لے کر آئی جنہیں نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان میں رہنے والے افسانہ نگاروں نے بھی شدت سے محسوس کیا اور اس احساس کی جڑیں معروضی حقائق، معاشرتی استبداد، انتشار، جبر و تشدد اور معاشرتی نا انصافیوں میں پیوست رہی ہیں۔اس موضوع پر پاکستان اور ہندوستان میں کئی غیر معمولی کہانیاں لکھی گئیں اس حوالے سے مشتاق قمر نے "معتوب شہر"، "جوگندر پال نے "باہر کے بھتیرے مسافر"، غیاث احمد گدی نے "ڈوب جانے

والا سورج"، قمر احسن کا افسانوی مجموعہ "صدیاں" ہندوستان سے بلراج کومل "آنکھیں اور پاؤں"، انور سجاد نے "سیاہ رات" اور "چھٹی کا دن"، رشید امجد نے "سناٹا بولتا ہے" اور "پیلا شہر سراب"، مظہر الاسلام نے "کلرکوں کے خواب"، امراؤ طارق نے "موچی موڑ"، منشایاد "بیک مرر"، آصف فرخی "شہر ماجرا"، انور سن رائے "چیخ" اور شہناز شورو "لوگ، لفظ اور انا" اور ان کے علاوہ دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی انتہائی موثر افسانے لکھے۔

اکیسویں صدی کا آغاز دہشت گردی اور جنگ وجدل سے ہوا، تاہم اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ افراد کی طرح ادوار اور زمانہ خود بخود تن تنہا ظہور نہیں کرتے اور نہ ان میں رونما ہونے والی تبدیلیاں یا حالات یکدم نمودار ہوتے ہیں۔ افراد کے رویوں کی طرح زمانے کا مزاج بھی آہستہ آہستہ مختلف عوامل کے زیر اثر تبدیل ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی رجحانات جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوئے اس کا آغاز بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں سے ہو گیا تھا اس حقیقت کو تب تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک ان کا مطالعہ نہ کیا جائے اور کچھ ایسی ہی صورتحال ادب کے مطالعے کے ضمن میں بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

اس ساری صورتحال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ دور تھا جب دنیا بھر میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایران انقلاب سے گزر چکا تھا، روس افغانستان کے ساتھ لمبے عرصے تک جنگ میں رہنے کے بعد آخر کار اپنی شکست تسلیم کر چکا تھا اور روس کے ہار تسلیم کرنے کے بعد افغان قبائل نے آپس میں طاقت کا کھیل شروع کر دیا تھا، عراق کی کویت پر مسلط مسلح جارحیت بھی بالآخر اپنے نتائج کو پہنچ گئی، روس جسے دنیا کی دوسری بڑی طاقت مانا جاتا تھا اور پورے نظام عالم میں کسی نہ کسی طرح اس کے طاقت کے توازن میں ایک اہم کردار بھی تھا اب اس کے انہدام کے بعد دنیا یک قطبی ہو چکی تھی اور امریکہ اور ایران کی درمیان حربی قوتوں کا ٹکراؤ بھی ختم ہو گیا۔ اب یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ واقعات برسوں پرانے ہو چکنے کے باوجود اقوام پہ ان کے اثرات وقت گزرنے کے ساتھ کم ہونے کے بجائے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ اسی دوران پاکستان نے چاغی کے مقام پر چھ ایٹمی دھماکے کر کے ایٹمی قوت ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ جب کہ جنوبی ایشیا میں ممالک کی اسٹریٹجک پوزیشن اور عالمی قوتوں کے ذاتی مفادات نے پہلے ہی یہاں کے حالات کو مشکل کیا ہوا تھا۔ ایسے میں بھارت اور پاکستان کے درمیان صورتحال جو پہلے بھی کچھ خاص اچھی نہ تھی اب مزید خراب ہو گئی۔ ایسے میں نہ صرف پاکستان اور بھارت بلکہ پوری دنیا پر جنگ کے بادل منڈلاتے نظر آتے ہیں کیوں کہ

اب اگر جنگ ہوئی تو وہ مقامی یا علاقائی نہیں ہوگی بلکہ اس کا عالمی جنگ میں تبدیل ہونے کا خاصا امکان ہے اور اس کے نتائج انتہائی تباہ کن ہونگے کیوں کہ جوہری ہتھیار اب دونوں طرف موجود ہیں۔

ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردو ادب کے لکھاری نے اپنی سماجی ذمہ داری اور عصری تقاضوں کے شعور کو بیدار کر کے اپنے افسانوں میں بروئے کار لایا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں انتظار حسین کا افسانہ "مور نامہ" دیکھنے کو ملتا ہے جس میں حکایت اور علامت کے امتزاج سے تخلیقی اسلوب پانے والا افسانہ جنگ اور اس کے زیر اثر انسانی نفسیات پر اس کے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک انسان اپنے اندر تخریب اور شر کے عنصر رکھتا ہے اور ان حالات کو بیان کیا گیا ہے کہ جن کے دباؤ میں آکر جنگ کرنے والے ایک لمحے کے لئے تحمل سے یہ سوچنے سے بھی عاری ہو جاتے ہیں کہ وقت کی ضرورت اور احوال کی نزاکت ان سے کیا تقاضا کر رہی ہے۔ ایسے میں ورثہ، عزت، راحت و سکون سب ختم ہو جاتا ہے۔

۲۱ویں صدی کی ابتدا میں جنگ کے حوالے سے جیلانی بانو کا افسانہ "عباس نے کہا" بھی اہم ہے اس افسانے میں جنگ کے دونوں معنی پر روشنی ڈالی گئی ہے ایک جسے جنگی جنون اور انسانیت دشمنی کہیں گے اور دوسرا اپنی بقا کا سوال۔ دیکھا جائے تو جنگ میں یہ دونوں پہلو غور طلب ہوتے ہیں ۔ جنگ میں شامل ایک فریق انسانیت دشمنی اور بربریت کا اظہار کرتا ہے جبکہ دوسرا فریق جس پر جنگ مسلط کی جاتی ہے اپنی بقا کے لیے لڑتا ہے تاکہ وہ اپنا دفاع کر کے خود کو مغلوب ہونے سے بچا سکے۔ اسی طرح کا ایک اور افسانہ "ابن آدم" جو کہ خالدہ حسین نے امریکہ اور عراق جنگ جسے امریکہ کی عراق پر جنگی جارحیت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تناظر میں لکھا ہے ۔ اس میں جنگی حالات اور اس کے تحت انسانی مسائل میں اضافے، ذہنی توڑ پھوڑ اور ان عوامل کے دباؤ میں انسانوں کی ہونے والی کایا کلپ کو بہت خوبصورتی کے ساتھ موضوع بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں لکھے گئے مزید افسانوں میں فردوس حیدر کا افسانہ "خالی ہوا یہ دل"، امراؤ طارق کا "آتش فشاں کی گود میں"، قمر احسن کا "صدیاں"، آصف فرخی کا "بلیک آؤٹ میں بچپن"، شہناز پروین کا "لہو رنگ سویرا"، شمیم منظر کا "زرد موسم سے پہلے" اور گلنار آفریں کا "لاش" اہم ہیں۔ آج اس حقیقت کے اعتراف سے کسی طور انکار ممکن نہیں کہ جنگ عصر حاضر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے افسانوں میں سیاست کے موضوع کو بھی اہمیت ملی ہے اس سلسلے میں یونس جاوید کا افسانہ "ستونت سنگھ کا کالا دن" اہم ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دو عمر رسیدہ آدمی لاہور میں ہونے والی اچانک اور غیر متوقع ملاقات سے جب تہ در تہ کھلتے ہیں تو اعلان آزادی کے دنوں تک فلیش بیک میں پھیلتا چلا جاتا ہے تب ہم دیکھتے ہیں کہ مدتوں ساتھ

رہنے، رنگ و نسل، مذہب اور زبان کی تفریق سے بالاتر ہو کر سماجی رشتے نبھانے والے افراد اور خاندان کس طرح سیاست کی بھینٹ چڑھتے ہیں اور ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں ساٹھ برسوں سے زیادہ طویل عرصے کی باتیں، یادیں، قصے سمیٹتے ہوئے افسانہ اختتام کو پہنچتا ہے مگر یہ اختتام نہیں ہے بلکہ سیاست ایک بار پھر پٹے ہوئے مہروں کو پیٹ ڈالتی ہے گویا کھیل ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ جاری ہے کسی اور عنوان کے ساتھ۔ اس کے علاوہ انور سجاد کا افسانہ "سیاہ رات"، کلام حیدری کا "ایک سال اور راستے سے ہٹا"، محمد منشایاد کا "کاشی"، علی حیدر ملک کا "ٹھنڈا سورج" اور بلراج کومل کا "آنکھیں اور پاؤں" اہم ہیں۔

اوپر بیان کی گئی افسانوی روایت سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جدید افسانہ دنیا میں رونما ہونے والی صنعتی ترقی و سائنسی ترقی اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا بلکہ موجودہ حالات کا حصہ بن کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اسی لئے اس کے دامن میں موجودہ عہد میں سامنے آنے والے خدشات، خطرات، عدم تحفظ، بے یقینی اور خوف و مایوسی کی صورت میں سمٹ سمٹا کر جمع ہو گئے ہیں۔ جدید عہد کی عطا کردہ اس بے یقینی اور عدم تحفظ کی فضا نے موجودہ نسل کی روح پر جبر اور ناانصافی کے جو زخم دیے ہیں ان سے اس نسل کو کب نجات ملے گی اس کا تو علم نہیں ہے مگر دل میں ایک آس اور امید ضرور ہے جو اسے مایوسی کے اندھیروں میں مکمل طور پر بھٹکنے سے باز رکھے ہوئے ہے اور یہ امید اس کا خواب بن چکی ہے کہ کاش اس کی آئندہ آنے والی نسلیں اس خوف اور بے اطمینانی کی فضا سے نجات حاصل کر سکیں۔

ا۔ کراچی اور کراچی سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار

کراچی شہر جو کہ صوبہ سندھ میں واقع، پاکستان کا پہلا دارالحکومت اور دنیا کے بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا ہے اسے "روشنیوں کا شہر" بھی کہا جاتا ہے۔ مگر آج کراچی کا نام سنتے ہی ہم ایک عجیب خوف کو اپنے ذہن میں ابھرتا محسوس کرتے ہیں اور یہ شہر روشنیوں کی بجائے خوف و دہشت بھرا شہر محسوس ہوتا ہے۔ پاکستانی ہونے کے ناطے اس شہر سے محبت کرنا اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنا ہمارے لئے لازم و ملزوم ہے۔ کیوں کہ ہم اس شے سے محبت کرتے ہیں جو ہماری سمجھ میں آتی ہے اور اس شے سے خوف کھاتے ہیں جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شہر کی حقیقت کو جانے بغیر اس کو درپیش مسائل کا احاطہ کرنا اور ان کا کوئی ممکنہ حل تلاش کرنا ممکن نہیں۔ کراچی شہر کو سمجھنے اور اس کو درپیش مسائل کا احاطہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

کراچی شہر کی تاریخ کو مختصر بیان کیا جائے۔ کراچی کے ابتدائی حالات کو بیان کرنے اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالنے والی غیر افسانوی تحریروں میں سیٹھ ناوں مل ہوت چند(۱۸۰۴ء۔۱۸۷۸ء) کی یاداشت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس یادداشت کا کچھ حصہ اجمل کمال کے جریدے "آج" (کراچی کی کہانی) میں شائع ہوا ہے۔ جس کے مطابق ناوں مل ہوت چند خود کو اندرون سندھ میں آباد "کاہری" ہندو زمینداروں، بیوپاریوں اور متمول صراف خاندان کی نسل سے بتاتا ہے جو کہ اندرون سندھ میں آباد تھے۔ وہ دریائی راستوں کے ذریعے اپنا سامان تجارت ساحل سمندر تک پہنچاتے تھے اور یہاں سے ہندوستان کے ساحلی شہروں اور خلیج کی سمندری بندر گاہوں تک تجارت کرتے۔ ان کے تجارتی کارندے مختلف علاقوں جن میں سون میانی، ٹھٹھہ، شکارپور، چانڈ اور بیلہ جیسے مقامات پر متعین رہا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ کارندے سارا سال سامان تجارت جمع کرتے اور باقی لوگ جمع شدہ سامان تجارت کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچایا کرتے تھے۔ انہی میں سے کچھ خاندان جب ندی کے کنارے کھڑک بندر نامی شہر میں آباد ہوگئے جو اس زمانے میں ایک بڑا تجارتی شہر ہوا کرتا تھا اور وہاں سے گوادر، بیلہ اور مسقط کے لئے تجارتی قافلے جایا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ شاہ بندر اور لاہری بندر میں بھی جو اس وقت دریائے سندھ پر واقع اہم بندر گاہیں شمار ہوتی تھیں ان لوگوں کی آبادیاں قائم ہوئیں اور یہاں سے سورت، پوربندر اور مالابار جیسے دورافتادہ مقامات سے تجارتی تعلقات بڑھائے جانے لگے۔ پھر یوں ہوا کہ کھڑک بندر کا دہانہ سمندر کی ریت سے آہستہ آہستہ بند ہوتا چلا گیا اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ یہاں سے تجارت کے مواقع محدود ہوتے نظر آنے لگے اور اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ سمندر کے کنارے واقع کسی دوسرے مناسب مقام اور بستی کا انتخاب کیا جائے جہاں سے سمندری تجارت کو فروغ دینا نسبتاً آسان ہو اور سود مند بھی ہو۔ چنانچہ ناوں مل ہوت چند کے بزرگوں میں سے ایک شخص سے "سیٹھ بھوجو مل" نے دوسرے معززین کی رائے سے بحر عرب کے ساحلی علاقوں میں کسی محفوظ مقام کی تلاش کی اور اس کی نگۂ انتخاب اس مقام پر پڑی جسے اس زمانے میں "دربو" کہا جاتا تھا۔ اس مقام کے قریب میٹھے پانی کا ایک بڑا چشمہ تھا جسے "کلاچی جو کن" کہا جاتا تھا۔ کلاچی میر بحروں کی ایک ذیلی قوم اور قبیلہ تھا جو اس مقام سے لے کر ٹھٹھہ اور سندھ کے دوسرے مقامات تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ دریائی اور سمندری راستوں کے نبض شناس اور سیاحت ان کے خمیر میں شامل تھی۔ سمندری راستے سے تجارت کے فروغ میں اس قبیلے نے اہم کردار ادا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی کلاچی قبیلے کے نام سے "کراچی" کا شہر موسوم ہوا تھا۔[۲۵]

۱۷۲۹ء کے آس پاس کے عرصے میں دربو کے علاقے میں کھڑک بندر کے ہندو تاجر آکر آباد ہونا شروع ہو گئے اورانہوں نے یہاں ایک نئی بستی بنائی اور پھر اس بستی کی حفاظت کیلئے مٹی گارے اور پتھر کی مدد سے ایک قلعہ تعمیر کیا اور بستی کی چاروں جانب ایک مضبوط دیوار بنائی۔اس دیوار میں دو دروازے رکھے گئے مغربی دروازہ جو کہسمندر کی طرف کھلتا تھااسے "کھارادر" کا نام دیا گیا اور شمال مشرق کی طرف کھلنے والے دروازے کو "میٹھا در" کہا گیا کیوں کہ وہاں ندی کی شاخ بہتی تھی اور میٹھے پانی کا تالاب اور جنگل بھی تھا۔ بعد میں انگریزوں کے قبضے کے بعد انگریزوں نے قلعے اور فصیل کو مسمار کر دیا لیکن کھارادر اور میٹھادر کے نام سے موسوم مقامات آج بھی انہی ناموں سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن اب ان دروازوں کے نشان اور آثار معدوم ہوگئے ہیں۔اس تمام کہانی کو جاننے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کراچی کی ابتدائی آبادی کے بسنے کی کہانی اور جواز کیا ہے۔

ناوں مل ہوت چند کی یاداشت سے ہمیں صرف جدید کراچی کے ابتدائی دنوں کی کہانی معلوم نہیں ہوتی بلکہ اس سے اندرون سندھ کی اٹھارویں اورانیسویں صدی کے ان سیاسی محرکات کا بھی پتہ چلتا ہے جو آخر کار سندھ پر انگریزوں کے قبضے، تصرف اور حکومت کی صورت میں سامنے آئے اور درون پردہ جاری ان سازشوں، سازبازوں اور گٹھ جوڑ سے بھی پردہ اٹھاتی ہے جو سندھی جاگیرداروں اور مقامی سرداروں نے انگریزوں سے کرر کھے تھے۔ اسی دوران چھوٹی موٹی جھڑپیں اور پھر آخر جنگ میانی جس کی فتح کے نتیجے میں انگریز سندھ پر حکمران بن کر بیٹھ گئے اتنی تفصیل سے شاید کہیں اور بیان نہ کی گئی ہو جتنی تفصیل سے ناوں مل ہوت چند نے اپنی یاداشت میں بیان کی ہے۔ اسی یاداشت کے بغور مطالعے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مل ہوت چند کے انگریز افسروں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات تھے چنانچہ انگریزوں کی ابتدائی سرگرمیوں اور کاروائیوں کی جھلک بھی اس یادداشت میں انتہائی تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اس یاداشت کے ذریعے اس سیاسی و سماجی رویے اور رد عمل کو بھی سمجھا جاسکتا ہے جو سندھ پر انگریز حکومت کے قیام کے بارے میں سندھ میں رہنے والے ہندو عاملوں اور عام ہندی آبادی نے اختیار کیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب برصغیر پاک وہند کی تقسیم کی نتیجے میں پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس وقت کراچی ایک ایسی صورت حال سے دو چار ہوا جسکا سرحد کی دونوں جانب واقع بڑے شہروں میں کسی کو بھی سامنانہ کرنا پڑا تھا۔ کراچی شہر میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی تقریبا پوری ہندو آبادی کو نقل مکانی کرنا پڑی اور نئ قائم شدہ سرحد کی دوسری جانب سے لوگ لاکھوں کی تعداد میں نقل مکانی کرکے یہاں بس گئے جنہیں اس شہر

کی ماضی اور تاریخ سے بالکل واقفیت نہ تھی جس کے نتیجے میں کراچی کے ماضی کے بارے میں کوئی ایسا مشترک اور مسلسل تصور برقرار نہیں رہ سکا جیسا کہ مثال کے طور پر لاہور، کلکتہ اور دہلی کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے مشترک تصور کی غیر موجودگی میں کراچی کے بارے میں مختلف نقطہ نظر رکھنے والے لوگ ایک دوسرے سے ہی کوئی بھی مثبت یا بامعنی مکالمہ کرنے سے قاصر ہیں۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں برپا ہونے والی نقل مکانی اور ہجرت کے تجربہ ہندوستانی عوام کے لیے بالکل نیا اور دھماکہ خیز تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کروڑوں خاندان اس طرح لٹی اجڑی حالت میں اپنے دیہات، قصبے، شہر، خاندان چھوڑ کر ایک بالکل نئی ان دیکھی جگہوں پر آبسنے پر مجبور تھے۔ بے زمین، بے سروسامان، ظلم و تشدد کے شکار اور خوف و ہراس میں مبتلا تھے۔ بے شک اس سے پہلے عالمی جنگوں کے نتیجے میں دنیا کے بعض حصوں میں بڑی نقل مکانی ہوئی تھی مگر بڑے پیمانے پر ایسی خون آشام نقل مکانی جس سے سرحد کی دونوں جانب لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں افراد متاثر ہوئے اس کی مثال گزشتہ کئی صدیوں کی انسانی تاریخ میں شاید ہی کہیں ملے۔ اتنے بڑے پیمانے پر نقل مکانی کے نتیجے میں بے شمار انسانی مسائل نے جنم لیا جس کے نتائج کسی نہ کسی صورت میں اب تک کراچی کی عوام بھگت رہے ہیں۔

کراچی شہر کے وجود میں آنے اور اس کے حوالے سے ضروری معلومات جاننے کے بعد اس شہر سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں اور انکی افسانہ نگاری کے حوالے سے جاننا بھی ضروری ہے۔ کراچی سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں میں اسد محمد خان، اخلاق احمد، نعیم آروی، انور سن رائے، غلام عباس، امراؤ طارق، زاہدہ حنا، مبین مرزا، انور احسن صدیقی، احمد زین الدین، شہناز شورو اور آصف فرخی وغیرہ شامل ہیں۔

غلام عباس کے نام سے کون واقف نہیں۔ غلام عباس کا شمار اپنے عہد کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ غلام عباس کے افسانے تعداد کے لحاظ سے کم ہیں۔ مگر اپنے خاص اسلوب اور موضوعات کے باعث اپنی پہچان آپ ہیں۔ آپ کے افسانوں میں فطری، معاشرتی اور نظام کا جبر غالب نظر آتا ہے۔ اور اس جبر کو وہ اپنے کرداروں کے ذریعے سمجھاتے ہیں لیکن کہیں بھی طنز کے تیر چلاتے نظر نہیں آتے۔ انسان اور انسانی صورت حال ان کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ آپ کے افسانوی مجموعوں میں آنندی، جاڑے کی چاندنی اور کن رس ہیں۔

غلام عباس بی بی سی کی ملازمت کے بعد پاکستان آئے تو انہوں نے اپنی مستقل آباد کاری کے لیے کراچی ہی کو منتخب کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بیشتر سال اسی شہر میں بسر کیے چنانچہ ان کے متعدد افسانوں کے خمیر یہیں سے اٹھے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے افسانے "بحران"، "کتبہ" اور ٹینڈر روالا" اہم ہیں۔

ہاجرہ مسرور نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کے سیاسی وسماجی مسائل کو موضوع بنایا۔ آپ کے افسانوی مجموعوں میں چرکے، چوری چھپے، ہائے اللہ، اندھیرے اجالے، چاند کی دوسری طرف اور تیسری منزل شامل ہیں۔ آپ کے افسانوں میں واقعاتی تناؤ اور کہانی پن روزمرہ زندگی کا بہاؤ یہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہاجرہ مسرور کے افسانوں تیسری منزل، چاند کی دوسری طرف اور اسٹینڈرڈ میں کراچی کے شہری معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اسد محمد خان نے اپنے افسانوں میں علامتی اسلوب کے ذریعے حقیقی کہانی پیش کرنے کے انداز کو پروان چڑھایا۔ اسد محمد خان نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کی جبریت کو حیات انسانی کے تسلسل میں دکھایا ہے۔ معاصر زندگی کی پیچیدہ حقیقتوں کو بیان کرنے میں انھوں نے گہرے مشاہدے کے ساتھ ساتھ اپنے مطالعے سے بھی بھرپور کام کیا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "کھڑکی بھر آسمان"، "برج خموشاں" غصے کی نئ فصیل"، "نرید ااور دوسری کہانیاں" اور "تیسرے پہر کی کہانیاں" شامل ہیں۔

زاہدہ حنا کا شمار ان باشعور خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے عورت ہونے کو ننگ و عار نہیں سمجھا بلکہ اسے اپنے لیے شرف و وقار بنایا۔ مسز عبد القادر، حجاب امتیاز علی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کی تخلیقی روایت سے منسلک ہو کر انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کیا اور عصر حاضر میں اپنی انفرادیت واضح کی۔ ان کے افسانوں میں سماجی ناانصافیوں اور کج رویوں کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ دانشورانہ امیج بھی نمایاں ہے۔ آپ کے افسانوی مجموعوں میں "قیدی سانس لیتا ہے"، "راہ میں اجل ہے"، "نہ جنوں رہا نہ پری رہی"، "رقص بسمل" اور "تتلیاں ڈھونڈنے والی" شامل ہیں۔ زاہدہ حنا نے اپنے افسانے "بہ ہر سو رقص بسمل بود"، "رنگ تمام خون شد"، "تتلیاں ڈھونڈنے والی"، "جسم وزباں کی موت سے پہلے" اور "آخری بوند" میں کراچی کے زوال پذیر معاشرے میں مذہبی و ثقافتی اقلیتوں پر گزرتی ہوئی بیدادگری کی کہانی بیان کی ہے۔

سلطان جمیل نسیم کا تعلق افسانہ نگاروں کی اس نسل سے ہے جس نے ۱۹۴۰ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کے تازہ مجموعے "ایک شام کا قصہ" میں شامل بیشتر کہانیاں شہر آشوب کی کہانیاں ہیں عام طور پر ان کی کہانیوں کو خوف کی کہانی کہا گیا ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانے "انکشاف"، "تیز ہوا کے بعد" اور "خاک کے سوا" قابل ذکر ہیں۔ اب تک سلطان جمیل نسیم کے چار مجموعے "کھویا ہوا آدمی"، "سایہ سایہ دھوپ"، "ایک شام کا قصہ" اور "میں آئینہ ہوں" شائع ہو چکے ہیں۔

امراؤ طارق نے جس دور میں اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ اسے رام لعل نے "بھیڑ بھاڑ کا دور" کہا ہے اور اس بھیڑ بھاڑ میں وہ کوئی کوئی نادرہ کار فن کار ہی تھا جو اپنے خاص اسلوب نگارش اور طرز ادا کی بنا پر علیحدہ پہچانا گیا ہو۔ اس نسل کے نمائندہ فن کاروں کی فہرست میں امراؤ طارق کا نام بھی شامل ہے۔ ان کے ہاں بعض دوسرے ہم عصر افسانہ نگاروں کی طرح وسیع موضوعاتی تنوع اور نت نئی اسلوبیاتی ایجاد و اختراع کی کاوشیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کی تخلیقی پہچان نیم علامتی اور استعاراتی اسلوب سے تشکیل پاتی ہے اور ان کے موضوعات شہری زندگی کے مسائل و معاملات سے اُبھرتے ہیں۔ خصوصاً کراچی میں جاری نسلی، سیاسی اور معاشی تصادم کو انہوں نے بنیاد بنایا ہے۔ اس آشوب میں فرد کی بے بسی، بے حرمتی اور خوف پر کہانیاں لکھی ہیں اور یہ کہانیاں ان کے افسانوں کے مجموعے "تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں۔ دستانے" میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ "بدن کا طواف"، "خشکی پر جزیرے" ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

نعیم آروی کا اصل نام نعیم الحسن تھا۔ آپ کے آباء واجداد ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور کراچی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ نعیم آروی نے اپنی افسانہ نگاری کی ابتدا ہی سے اپنی آس پاس کی رستی بستی زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔ نعیم آروی کے افسانوں میں بڑے شہر کی زندگی، نچلے اور متوسط طبقے کے ان افراد کو اپنا موضوع بنایا ہے جو شب و روز اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف ہیں وہ نئی نسل کے ان چند افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جو لفظی بازی گری، عدم ابلاغ اور بے کہانی کے افسانوں کے پر آشوب دور میں کہانی ہی کو وجہ افتخار سمجھتے تھے۔ ان کے افسانوی مجموعے میں "سوا نیزے پر سورج"، "بستی کا آخری آدمی"، "گرد آلود شام" اور "زرد موسموں کا عذاب" شامل ہیں۔

مبین مرزا ادبی جریدے "مکالمہ" کے مدیر ہیں۔ افسانہ نگار کے طور پر مبین مرزا کی تخلیقی پہچان "خوف کے آسمان تلے" سے ہوئی۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۴ء میں اکادمی بازیافت، کراچی سے شائع ہوا۔ ان افسانوں میں جبر و تشدد، وحشت اور خوف کی فضا پورے طور پر موجود ہے جو جدید زندگی میں انسان کا مقدر رہے تاہم مبین مرزا

نے اپنا لینڈ سکیپ کراچی اور اس کے مضافات میں تلاش کیا اور شعوری طور پر اس شہر میں بسنے والوں کے دکھ اور المیے کو موضوع بنایا ہے۔

اخلاق احمد تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح افسانہ نگاروں کی محفل میں وارد ہوئے ہیں اور انھوں نے مختصر سی مدت میں اس بات کا احساس دلایا ہے کہ نت نئے لکھنے والے صورت حال کی سنگینی کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ وہ معاشرتی عوامل کے خلاف ردعمل بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ پیش کرنا جانتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے "جانے پہچانے" میں کل دس افسانے ہیں اور ان میں بیشتر افسانوں کا محل وقوع کراچی ہے۔

ناصر بغدادی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "بے شناخت" جبکہ دوسرا "مصلوب" ہے۔ ان کے اکثر افسانے کراچی میں ڈوبتی ابھرتی زندگی سے متعلق ہیں۔ نسلی و لسانی تعصبات اور تشدد و ہنگامہ آرائی کو انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

آصف فرخی کا شمار جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے آٹھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں کراچی کے مسائل کو ذرا مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے ان کے بیشتر افسانے کراچی شہر کی سماجیات کو اپنا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے افسانوی مجموعے "شہر بیتی"، "شہر ماجرا اور" میرے دن گزر رہے ہیں" قابل ذکر ہیں۔

المختصر کراچی سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں میں انور سن رائے، مرزا حامد بیگ، انور احسن صدیقی، احمد زین الدین، ناصر بغدادی اور شہناز شورو وغیرہ کے نام اہم اور قابل ذکر ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ نگینہ جبین، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ (۱۹۴۷ء اور اس کے بعد)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، اشاعت اول ۲۰۰۲ء، ص:۲۔

۲۔ فیروز الدین، مولوی، الحاج، فیروزاللغات اردو، فیروز سنز پرائیویٹ، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص:۹۵۵۔

۳۔ وارث سرہندی، علمی اردو جامع لغت، علمی کتب خانہ کبیر سٹریٹ، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص:۹۵۵۔

۴۔ آکسفورڈ ایڈوانس لرنر لغت، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۴ء، ص:۱۲۲۶۔

۵۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشافِ تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص:۱۸۰۔

۶۔ مصلح الدین صدیقی، محمد، (مرتب)، سماجیات، اعظم اسٹیم پریس، حیدر آباد، دکن، اشاعت اول جنوری ۱۹۵۱ء، ص:۵۔

۷۔ ایضاً، ص:۵۔

۸۔ شان الحق حقی (مرتب)، آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ص: ۱۰۰۸۔

۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب)، قومی انگریزی اردو لغت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص:۱۲۳۱۔

۱۰۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، اس شہر میں رہنا، مشمولہ کراچی کی کہانی ۲، مرتبہ اجمل کمال، آج پبلشرز، کراچی، ص:۵۷۷۔

۱۱۔ رخسانہ پروین، آصف فرخی کی کہانی، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۹ء، ص:۲۰۔

۱۲۔ ایضاً، ص:۲۱

۱۳۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، آتش فشاں پر کھلے گلاب، طارق پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۲ء ص:۷۔

۱۴۔ آصف فرخی، شہر بیتی، مکتبہ دانیال کراچی، ۱۹۹۵ء، ص:۹

۱۵۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، آتش فشاں پر کھلے گلاب، طارق پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۲ء ص:۷۔

۱۶۔ نیر مسعود، محسن خان، انیس اشفاق، انٹرویو آصف فرخی سے بات چیت، مشمولہ "سوغات"، بنگلور، انڈیا، ۱۹۹۲ء، ص:۳۱۷۔

۱۷۔ عرفان جاوید، "مقدمہ سمندر کی چوری"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص۱۱۔

۱۸۔ قمر احسن، "آشوب اور نومہ کا افسانہ نگار آصف فرخی"، مشمولہ، "سوغات" شمارہ نمبر ۲، محمود ایاز پبلشرز، بنگلور انڈیا، مارچ ۱۹۹۶ء، ص:۲۹۹۔

۱۹۔ آصف فرخی، چیزیں اور لوگ، احسن مطبوعات، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص:۱۳۷

۲۰۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلا آباد، ۲۰۰۸ء، ص:۳۰۴۔

۲۱۔ وقار عظیم،، "داستان سے افسانے تک"، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۳ء، ص:۲۲۔

۲۲۔ وزیر آغا، "اردو افسانے کے تین ادوار"، مشمولہ "مکالمہ ۱۶"، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۶ء، ص:۵۶۳۔

۲۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر، "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ"، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص:۲۴۔

۲۴۔ جمیل اختر محبی، ڈاکٹر، "فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ"، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص:۱۶۔

۲۵۔ سید مظہر جمیل، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص:۱۱۶

باب دوم

آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے انفرادی مسائل کا تجزیہ

الف: آصف فرخی کے منتخب افسانوں میں فرد کی نفسیات کا کراچی کے مسائل کے تناظر میں تجزیہ

کراچی نے قیام پاکستان کے بعد سے لے کر اب تک مختلف ادوار کو دیکھا ہے۔ آصف فرخی کے آباؤاجداد ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے لیکن آصف فرخی نے کراچی میں ہی اپنی آنکھ کھولی اور اس وقت سے لے کر اب تک کراچی کو مختلف نشیب و فراز سے گزرتے دیکھا اور بڑی گہرائی سے ان تمام حالات و واقعات کا مشاہدہ بھی کیا۔نہ صرف یہ بلکہ کراچی کے بدلتے حالات اور تبدیل ہوتے منظر نامے کو دیکھا ہے بلکہ ان تمام تبدیلیوں اورواقعات وحالات نے کراچی میں رہنے والے فرد کی نفسیات کو کس طرح متاثر کیا ہے۔اس کا بھی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اوراپنے اس مشاہدے کو اپنے افسانوں کا حصہ بنا دیا ہے۔کراچی جو کہ ۱۹۸۰ء سے پہلے اپنی فضا میں ہر لمحہ محبت اور خوشیوں کی خوشبو بکھیر رہا تھا اچانک اس شہر کو کسی کی نظر لگ گئی۔دن رات روشنیوں میں جگمگاتا شہر اندھیروں میں ڈوبنے لگا۔محبت اور خوشیوں سے بھرپور فضا خوف اور دہشت کی فضا میں تبدیل ہو گئی۔

کراچی شہر کو پچھلی کچھ دہائیوں سے درپیش سب سے بڑا مسئلہ امن وامان کی بگڑتی صورتحال کا ہے۔۱۹۸۵ء کے بعد شہر میں ہونے والی کچھ سیاسی تنازعات،عوامی فرقہ وارانہ مسائل اور فوجی کارروائیوں کی وجہ سے آئے روز ہونے والی قتل وغارت کے حادثات نے کراچی شہر میں رہنے والے افراد کو ذہنی طور پر بہت متاثر کیا نہ صرف یہ بلکہ شہر میں امن وامان کی اس بگڑتی صورتحال میں ڈاکوؤں، لٹیروں، بھتہ خوروں اوراغواکاروں نے بھی اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جہاں تک ممکن ہوا عوام کا سکون لوٹنے اور شہر کو تباہ کرنے میں اپنا پورا پورا کردار ادا کیا ہے۔اس ساری صورتحال میں نہ صرف شہر میں رہنے والے بلکہ دوسرے شہروں سے اپنے کسی کام کے سلسلے میں کراچی آنے والے افراد بھی اس شہر میں داخل ہوتے ہوئے خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتے ہیں۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں افراد کی ان نفسیاتی کیفیات کو کراچی کے

مسائل کے تناظر میں خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کراچی میں ہونے والے آئے دن کے قتل و غارت کے واقعات اور لوٹ مار سے نہ صرف اس شہر میں مقیم افراد خوفزدہ ہیں بلکہ دوسرے شہروں سے کراچی آنے والے بھی کراچی کا نام سنتے ہی ایک عجیب خوف محسوس کرتے ہیں۔ خوف کی اسی کیفیت کو افسانے "ملاقات" میں مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے کہ دو دوست جن میں سے ایک لاہور کا رہنے والا ہے جب اسے کسی دفتری کام کے سلسلے میں کراچی بھیجا جاتا ہے تو کراچی کا نام سنتے ہی نہ صرف وہ خود بلکہ اس کے اہل خانہ بھی خوف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کی مخالفت بھی کرتے ہیں اور کراچی میں رہنے والے دوست سے کراچی میں موجود ہوتے ہوئے بھی وہ صرف فون پر ہونے والی بات چیت کو کافی سمجھتا ہے کیونکہ اسے کراچی کے حالات کا کوئی بھروسہ نہیں۔ نہ جانے کب کیا ہو جائے اور ایسے میں اس شہر میں کہیں اور نکلنے کی ہمت نہیں ہے۔ شہر میں ہونے والے اچانک فائرنگ اور دہشت گردی کے واقعات نے نہ صرف شہر میں مقیم افراد کو مسلسل خوف اور عدم یقین کا شکار کر رکھا ہے بلکہ دوسرے شہروں سے آنے والوں کو بھی ذہنی طور پر خوفزدہ کر دیا ہے۔

> "ارے ایسی بھی کیا بات ہے؟ میں تمہیں خود لینے آ جاؤں گا، اور پھر آج گولیاں بھی نہیں چل رہی۔۔۔ میں نے اسے تسلی دینا چاہی۔ نہیں بھئی۔ کراچی کا کیا بھروسہ۔ ہوٹل کی شٹل سروس کا وقت ہو جائے گا تو میں چلا جاؤں گا۔ شہر میں اور کہیں نکلنے کی ہمت نہیں ہے"[1]

شہر میں ہونے والے آئے دن کے بدامنی کے واقعات نے شہریوں کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ فائرنگ اور قتل و غارت کے واقعات نے فرد کو اس قدر بے بس اور مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنا گھر، گلی کوچے اور علاقہ جس میں اس نے اپنی آنکھ کھولی اور بچپن کے بہترین دن گزارے ان کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہے نہ صرف یہ بلکہ اس شہر میں رہنے والے افراد نفسیاتی طور پر خود کو حالات کے سامنے اس قدر مجبور اور لاچار سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی چور، لٹیرا ان کے گھر میں زبردستی داخل ہو جائے تو اس کے سامنے اپنی جان اور مال کی حفاظت کیلئے مزاحمت کرنے کو بھی اپنی غلطی تصور کرتے ہیں یعنی اگر اس شہر میں اپنی جان بچانا چاہتے ہیں تو خود کو ذہنی طور پر ایک مفلوج انسان سمجھ لیں جو اپنے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی اور اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات کو دیکھ تو سکتا ہے مگر اس کے رد عمل میں کچھ کرنے سے قاصر ہے۔ "جو مانگتے ہیں چُپ چاپ اٹھا کر ان کے حوالے کر دو۔ سمجھو جان کا صدقہ گیا۔ ہتھیار اٹھائے ہوتے ہیں ان کو تو Resist کرنا ہی نہیں چاہیے۔"[2]

شہر میں ہونے والے آئے دن کے دہشت گردی کے واقعات نے فرد کو مسلسل بے یقینی کا شکار کر رکھا ہے یہاں تک کہ شادی بیاہ کی تقریبات جن کی تاریخ اور دن طہ کیے جا چکے ہیں اس کے باوجود اس بات پر پورے اعتماد سے نہیں کہا جا سکتا وہ اسی طے شدہ تاریخ پر بخیر و عافیت انجام پذیر ہو پائیں گے کہ نہیں اگر ہونگے بھی تو کیسے ہونگے؟ شادی بیاہ کی تقریبات جنہیں لوگ بڑے جوش و خروش اور خوشی کے ساتھ دھوم دھام سے مناتے تھے اب مسلسل پریشانی اور خوف کا شکار ہو گئی ہیں۔ شہری شہر کے حالات سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ شادی کی تقریبات میں بھی سکیورٹی کے لیے گن مین رکھوائے جانے لگے ہیں جو شادی ہال میں موجود مہمانوں اور دلہن کی حفاظت کر سکیں۔ جہاں خوشی کی تقریبات کو بھی اس قدر ڈر اور خوف کے ساتھ منایا جائے وہاں کے افراد کی ذہنی حالت کس قدر دباؤ کا شکار ہو گی۔ یہاں خوشیوں پر خوف نے اپنا پہرا بٹھا رکھا ہے۔ ایسے میں خوشی کی تقریبات کو بھی سادگی اور خاموشی سے چھپ چھپا کر منانے کو ترجیح دی جا رہی ہے تا کہ مزید کسی بھی قسم کی پریشانی سے بچا جا سکے۔

شہر کے حالات کے ساتھ ساتھ شہریوں کی زندگی بھی قابل رحم بن گئی ہے ایسے میں کراچی میں افراد کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا جا رہا ہے۔ ملک کے بااثر افراد شہریوں کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہے ہیں جبکہ شہر میں طاقت ور طبقہ اپنی طاقت دکھا رہا ہے۔ ایسے میں ڈاکو، چور اور لٹیرے اس ساری صورتحال سے مکمل فائدہ اٹھا رہے ہیں اور شہری زندہ لاش کی طرح اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو سہنے پر مجبور ہیں۔ جہاں روز مرہ ہونے والی ہڑتالوں، سیاسی جماعتوں کی جانب سے "سوگ کی اپیل"، حکومتی اہلکاروں کے شہر کے ہنگاموں میں ملوث خفیہ چہروں کو بے نقاب کرنے اور چند مخصوص افراد کو لاکھوں شہریوں کی جان و مال سے کسی قیمت پر کھیلنے کی اجازت نہ دینے کی روزانہ کے اعلان اور نہ صرف یہ بلکہ روز کسی نہ کسی اچانک نامعلوم افراد کے ہاتھوں مارے جانے والے دس بارہ افراد کے قتل جیسی خبریں اب شہریوں کے لیے معمول کا حصہ بن گئی ہیں اور یہ خبریں کسی طور پر بھی شہریوں کو چوکنے پر مجبور نہیں کرتی۔ بلکہ اب شہریوں نے اس ساری صورتحال کو ذہنی طور پر قبول کر لیا ہے۔ اب روزانہ شہر میں دس بارہ افراد کے قتل کو روز مرہ ہونے والے دوسرے معمول کے کاموں کی طرح کا ایک واقعہ سمجھتے ہیں۔ افسانہ "فریکچر" اور "شہر بین" اس کی بہترین مثال ہیں۔

اس شہر کو کسی کی نظر لگ گئی ہے کیونکہ وہ شہر جس میں زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رونقیں بکھیر رہی تھی اس شہر کے رہنے والے باسی اس میں دن رات بغیر کسی خوف اور ڈر کے اپنی زندگیاں مکمل اطمینان اور سکون کے ساتھ بسر کر رہے تھے کہ اچانک ہی کچھ ایسا ہوا کہ اس شہر کی کایا پلٹ گئی ہے۔ رات بھر آزادی

سے سانس لینے والے افراد اب دن دھاڑے بھی گھروں سے باہر نکلنے میں خوف محسوس کرنے لگے ہیں۔ ایسا لگتاہے کہ اس روشنیوں بھرے شہر کو خوف کی آندھی نے آگھیرا ہے۔ کراچی جسے روشنیوں کا شہر کہا جاتا تھا اب خوف اور دہشت کا اڈا بن گیاہے۔ ایسے میں وہ افراد جنہوں نے اس شہر کی رونقوں کو بھرپور طور پر دیکھا تھا اور ان سے لطف اٹھایا تھا وہ اس خون آلود فضا کو دیکھ کر ذہنی طور پر کس قدر کرب اور اذیت کا شکار ہیں وہی جانتے ہیں۔ آصف فرخی نے چونکہ اسی شہر میں آنکھ کھولی، اس میں اپنے بچپن اور جوانی کے بہترین دن گزارے، کراچی کو ہر طرح کے حالات کا سامنا کرتے ہوئے بھی دیکھا ایسے میں جب کراچی پر یہ کٹھن وقت آیا تو آصف فرخی نے اس کو نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ جھیلا بھی ہے۔ اسی لیے آپ نے اپنے افسانوں میں کراچی کو درپیش مسائل اور ان کے تناظر میں فرد کی نفسیات کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ آصف فرخی کے افسانوی مجموعے "شہر ماجرہ" میں فرد کی نفسیات اپنے شہر کے حالات کے نتیجے میں مزید شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ افسانہ "ڈرائے گئے شہروں کے باطن" میں ایک ایسے گھرانے کے فرد کی نفسیات کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جسے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک گھر کی نہیں بلکہ کراچی میں مقیم ہر فرد کی ذہنی حالت ہے۔ اس افسانے میں بتایا گیاہے کہ فرد کس طرح اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات کے ہاتھوں مجبور ہے نہ صرف یہ بلکہ بعض اوقات روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو بتانے میں بھی اس قدر بیزاری اور اکتاہٹ کا احساس ہوتا ہے کہ گھر والوں کو دیر سے گھر پہنچنے کی وجوہات کا بتانے کا سوچ کر ہی فرد ذہنی تھکن محسوس کرنے لگتا ہے اور گھر میں موجود افراد الگ سے ایک مسلسل پریشانی کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ شہر کے حالات اس قدر تشویشناک ہے کہ افراد اس تلخ اور اذیت ناک حقیقت پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اور حقیقت سے نظریں چراتے ہوئے وہ اپنے ذہن کو جھوٹے خیالات و تسلیوں سے بہلانے اور خود کو اس خوف کا شکار ہونے سے بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں جبکہ وہ جانتے کی آنکھیں بند کرنے سے حقیقت بدل نہیں سکتی۔

> "اب اسے گھر میں جواب دینا ہوگا وہ موڑ کاٹتے ہی احساس ہوا کہ گھر واپسی کا راستہ سامنے ہے، توجو پہلا خیال ذہن میں آیا، وہی رہ رہ کر سارے راستے اس کے چبھتا رہا۔ اب گھر آئے گا وہ جیسے یہ سوچ کر ہی تھک گیا۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی اس کیفیت کا احساس ہوگا جس کو وہ کوئی نام نہیں دے سکتا، لیکن جس کی موجودگی میں اس کے اعصاب تنے رہتے ہیں۔" [۳]

کراچی جیسے شہر میں رہنے والے افراد کی ذہنی حالت کا بخوبی اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مذہب جس میں انسان آسودگی اور چین تلاش کرتا ہے اب وہ مذہبی رسومات کی ادائیگی کے مقامات یعنی مساجد کو بھی عبادت کی ادائیگی کیلئے محفوظ نہیں سمجھا جارہا۔ ان میں موجود نمازیوں کو بھی دہشت گردی کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ جہاں کوئی بھی کسی بھی وقت بلا خوف و جھجک جا سکتا تھا اب وہاں بھی سکیورٹی نافذ کر دی گئی ہے۔ اب نمازیں بندوقوں اور رائفلوں کے سائے تلے ادا کی جارہی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان مقدس مقامات پر حملے بھی معصوم شہریوں کی گاڑیوں کو چوری کر کے کیے جارہے ہیں اور فرد کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی سب سے پیاری چیز کو قربان ہوتے دیکھ رہا ہے مگر وہ کچھ بھی کہنے اور کرنے سے قاصر ہے۔ ایک فرد جسے اپنی گاڑی اس قدر عزیز تھی اور وہ اسے دلہن کی طرح سجائے رکھتا تھا جب وہ چوری ہو گئی اور اسے ایک مسجد میں دہشت گردی کے واقعہ میں استعمال کیا گیا تو اس نے اپنی اس جان سے عزیز گاڑی یعنی "شہ گام" کو اپنانے سے محض اس لیے انکار کر دیا کیونکہ اسے اس میں سے مسجد میں ہلاک ہونے والے نمازیوں کے خون کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ شہر کے حالات نے اسے اس کی عزیز ترین چیز سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ ایسے حالات میں فرد کی نفسیات ہر وقت بے یقینی اور بے بسی کا شکار نظر آتی ہے اور اسی نفسیاتی کیفیت کو آصف فرخی نے اپنے افسانے "خواجہ اجمیر نگری" میں بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک ماں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے بچے کو جوان کرتی ہے تاکہ وہ بڑے ہو کر اس کا سہارا بنے گا مگر ایک دن اس کے علاقے میں اچانک ہونے والی فائرنگ کے نتیجے میں وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو کھو دیتی ہے اور ایک بار پھر زندگی کے اسی مقام پر واپس کھڑی ہو جاتی ہے جہاں سے اس نے زندگی کا کٹھن سفر شروع کیا تھا مگر اب کی بار اس کے ہاتھ اس امید سے خالی ہیں جس کے سہارے وہ زندگی کے کٹھن سفر پر زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے چلی تھی۔

کراچی میں پچھلے کچھ عرصے سے شروع قتل وغارت اور دہشت گردی کے واقعات نے شہریوں کو ایک مسلسل خوف اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے وہ نہیں جانتے کہ کب کسی انجان گولی کے ہاتھوں ان کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس دردناک موت کا خوف ہر وقت ان کے اعصاب پر طاری رہتا ہے۔ اس مسلسل خوف نے فرد کو نفسیاتی طور پر اس قدر مضطرب کر دیا ہے کہ وہ نیند میں بھی خوف کا شکار ہے۔ اس کے خوابوں پر بھی شہر کے حالات نے اپنا قبضہ جما رکھا ہے نیند سے جاگنے کے بعد بھی یہی کیفیت ہے پورا شہر ایک گپ اندھیرے میں ڈوبا معلوم ہوتا ہے۔ افسانے "دستنبو" میں فرد کی اسی ذہنی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔

"یہ بلیک ہول ہے، تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں ہو۔۔۔۔مجھے لگتا ہے میری زندگی میں گڑھا پڑ گیا ہے جو میرے یہ دوچار برس اس طرح نگل گیا ہے کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ختم ہوگئے اتنے سال۔اور جب ایک بار زندگی سے وقت کا اتنا بڑا ٹکڑا غائب ہو جائے تو پھر کیا ہوتا ہے، مجھے پتہ چل رہا ہے۔۔۔۔میرے شہر اور میرے لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے میں اس کا خاموش تماشائی نہیں بن سکتا، میں اس شہر کا درد سہنا چاہتا ہوں، میں اس میں پوری طرح ملوث ہونا چاہتا ہوں لیکن میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔"[۴]

مذکورہ بالا افسانے میں فرد کی نفسیات شہر کے حالات کے باعث الجھاؤ کا شکار دکھائی دیتی ہے۔اسی طرح افسانوی مجموعے "میرے دن گزر رہے ہیں" میں شامل افسانوں میں بھی آصف فرخی اپنے شب وروز میں پیش آنے والے واقعات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیفیت کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔اس مجموعے میں شامل ایک افسانہ "پرندے کی فریاد" میں موجودہ دور کے فرد کی نفسیات اور اس کی ذہنی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح پنجرے میں قید پرندے غم اور خوف کا شکار ہوتے ہیں اسی خوف کے باعث وہ پنجرے کے ایک کونے میں سکڑے سہمے بیٹھے ہیں اور جب کوئی انجان ہاتھ انہیں اس پنجرے سے رہائی دلانے کے لئے لیے پنجرے کے اندر ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر انہیں باہر نکالتا ہے تو اسے ان کے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔اسی طرح اس شہر کراچی میں رہنے والا ہر فرد خود کو اس شہر میں قید سمجھتا ہے وہ روزانہ ایک لگی بندھی روٹین کے ساتھ مختلف علاقوں سے گزرتا ہوا پھر واپس وہیں لوٹ آتا ہے اس کے ارد گرد ان دیکھا پنجرہ ہے جو کسی کو نظر نہیں آتا۔شہر کی اس ہنگامی اور مصروف زندگی نے فرد کو قید کر کے لاچار کر دیا ہے وہ چاہ کر بھی خود کو اس گھٹن زدہ ماحول اور قید سے آزاد نہیں کرواسکتا اور نہ ہی اُسے کوئی ہاتھ نظر آتا ہے جو اسے اس قید سے آزاد کرا دے اور کچھ نہیں تو اس پنجرے کو کشادہ ہی کر دے مگر شاید یہ کسی کے اختیار کی بات نہیں ہے۔

"مگر مجھے آزاد کون کرے گا؟ مجھے کسی کا ہاتھ اپنے پنجرے کے باہر نظر نہیں آتا کوئی میرے لیے اس آسمان کو پھیلا دے، یہ زمین چھوٹی پڑنے لگی ہے۔کچھ نہیں تو اس پنجرے کو وسیع کر دے۔شاید یہ کسی کے اختیار کی بات نہیں۔پنجرے میں بند چڑیا کا اپنی فریاد پر اختیار ہے نہ دل کے دھڑکنے پر۔"[۵]

یعنی فرد کے لیے زندگی اب بوجھ بن کر رہ گئی ہے۔ کبھی وہ اپنے شہر کے حالات سے خوفزدہ ہو کر خود کو بے بس اور مجبور تصور کرنے لگتا ہے تو کبھی موجودہ صورتحال اُسے اپنے مستقبل سے نااُمید کر دیتی ہے۔ فرد خود کو آزاد ہوتے ہوئے بھی قید تصور کر رہا ہے۔

ب۔ آصف فرخی کے منتخب افسانوں میں فرد کے سماجی مسائل کی پیش کش کا تجزیہ

یہ دنیا جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں مختلف قسم کے معاشروں اور سماج سے مل کر بنی ہے۔ ایک سماج میں مختلف طبقات، مذہب، رنگ و نسل اور زبان سے تعلق رکھنے والے افراد رہتے ہیں، جو اس سماج کو مل جل کر باہمی اتفاق سے پروان چڑھاتے ہیں۔ انسان چونکہ ایک سماجی حیوان ہے اس لئے وہ دوسرے انسانوں اور سماج سے کٹ کر الگ سے زندگی بسر نہیں کر سکتا اور سماج میں دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر فرد جو اس سماج سے تعلق رکھتا ہے اپنے حقوق و فرائض سے بخوبی واقف ہو اور اپنے حقوق و فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ برتے لیکن جب فرد اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بخوبی نہیں نبھائے گا تو سماج یا معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو جائے گا اور معاشرے میں بہت سی برائیاں اور مسائل جنم لینے لگیں گے اور پھر ان مسائل کی وجہ سے اس سماج سے تعلق رکھنے والے افراد ظاہری اور باطنی طور پر متاثر ہوں گے۔

کراچی شہر کو میٹروپولیٹن اور کاسموپولیٹن شہر کہا جاتا ہے کیونکہ اس شہر میں قیام پاکستان سے پہلے کے آباد مقامی سندھی، قیام پاکستان کے بعد بھارت سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین، پاکستان کے مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والے افراد جو معاش کے حصول کے لیے اس شہر میں آباد ہیں کہ علاوہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد زندگیاں گزار رہے ہیں۔ یہ شہر پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی شہر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۲۰۰۰ء میں کراچی کی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی جس میں اردو زبان بولنے والے مہاجر ۵۲ فیصد جبکہ باقی آبادی پنجابیوں، پشتونوں، افغانیوں، بلتستانیوں، بلوچوں، مکرانیوں اور آزاد کشمیریوں پر مشتمل ہے۔ یہاں تک کہ ان میں بنگالیوں اور برمیوں کی بھی تعداد تقریباً دس لاکھ کے قریب ہے جنہیں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد غیر قانونی قرار دے کر نکال دیا گیا تھا اور وہ کراچی میں آکر آباد ہو گئے۔ روزگار کے حصول کے لیے آنے والے اندرون ملک کے شہریوں کا سلسلہ بھی مستقل قائم ہے اور ملک کی کوئی ایسی زبان نہیں ہے جو کراچی میں نہ بولی جاتی ہو۔ ۱۹۴۷ کے نیم خوابیدہ شہر کو انسانوں کے سمندر میں تبدیل

ہونے میں چند دہائیاں صرف ہوئی ہیں یہاں مختلف اور متنوع رنگوں کی آمیزش سے ایک ایسا ملا جلا سماج بن چکا ہے جو کہ کراچی کی مخصوص معاشرت میں بدل گیا ہے اور کراچی میں رہنے والا ملک کے کسی بھی حصہ سے کیوں نہ آیا ہو اس کی طرز بود و باش پر ایک طرح کی مخصوص چھاپ کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ آصف فرخی کے افسانوں کا ایک بڑا اور اہم موضوع جدید دور کے انسان کے سماجی مسائل ہیں۔ آج کا انسان بہت سے سماجی مسائل کا شکار ہے۔ یہ مسائل کسی نہ کسی طرح سے اس کے خود کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ آصف فرخی اپنے افسانوں میں بظاہر تو کراچی میں رہنے والے فرد کی کہانی کو بیان کرتے ہیں مگر غور کیا جائے تو وہ کہانی پورے ملک اور پاکستانی سماج کا المیہ ہے۔

آصف فرخی کے مطابق جدید دور کے انسان کو سب سے بڑا سماجی مسئلہ فرد کی شناخت کی گمشدگی کا ہے۔ فرد اپنی تہذیب سے دور ہو کر اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے۔ جب انسان اپنی تہذیب کو بھلا دیتا ہے تو وہ اپنی اصل پہچان کو بھی کھو بیٹھتا ہے اور چاہ کر بھی اپنے وجود کی شناخت نہیں کر پاتا اور نہ ہی کروا پاتا ہے۔ آصف فرخی اپنے افسانوی مجموعے "میں شاخ سے کیوں ٹوٹا" میں شامل زیادہ تر افسانوں میں شناخت کی گمشدگی کو موضوع بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں جب بچے کی پیدائش ہوتی تھی تو اس کی آنول نال کو بچے کی ناف سے الگ کر کے زمین میں دفن کیا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ آدمی کی اپنے زمین سے محبت اور اپنائیت ہوتی تھی کیونکہ اس کی آنول نال اس زمین میں دفن تھی جب کہ آج کل کے دور میں بچے کی ناف سے آنول نال کو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی نوجوان نسل میں مٹی سے محبت کا جذبہ ماند پڑ گیا ہے، وہ اپنی تہذیب کو بھول بیٹھے ہیں۔

> "آنول نال ساتھ نہیں کہ ماں باپ کے ہاتھ سے زمین میں گاڑ دی جائے۔ میں جانوں کس کی نال ہی نہیں گڑتی۔ جبھی تو آج کل کے لوگوں کے لئے مٹی میں ماما نہیں ہوتی۔"[۶]

"ناف" کے علاوہ مذکورہ بالا مجموعہ میں گوہائی، درخت کا ڈر، درخت کی دعا اور اسلام علیکم یا اہل القبور ایسے افسانے ہیں جن میں تہذیبی شعور کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان افسانوں میں انفرادیت کا جذبہ بھی نمایاں ہے مگر ایسی انفرادیت جس میں اپنی تہذیب کے ساتھ رہنے کا جذبہ بھی ہے اگر یہ جذبہ ختم ہو جائے تو انسان لاوارث اور بے نشان ہو جاتا ہے۔

آصف فرخی کے افسانے سماجی شعور کے آئینہ دار ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں فرد کو درپیش ہر قسم کے سماجی مسائل کی عکاسی بڑی مہارت سے کرتے ہیں کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اپنے ہر افسانے میں وہ اپنے شب وروز کے مسائل کی کہانی سنا رہے ہیں مگر دراصل وہ اپنی حقیقی زندگی میں اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات اور ان کے نتیجے میں فرد پر پڑنے والے اثرات کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے انہیں اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں ایسے ہی فکر معاش جیسے بڑے اور تکلیف دہ سماجی مسئلے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فکر معاش انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور مسئلہ ہے جس سے کبھی بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ فرد کا تعلق چاہے کسی اونچے طبقے سے ہو یا نچلے طبقے سے وہ ہر وقت معاش اور روزی کی حصول کے لیے سر گرداں دکھائی دیتا ہے اور بعض اوقات روزگار کی حصولیابی کے لیے کسی بھی حد سے گزرنے سے گریز نہیں کرتا اور راتوں رات امیر بننے کی اسی خواہش نے معاشرے کو عدم مطابقت کا شکار کر دیا ہے فرد دولت کی حصولیابی کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔ "بونسائی" افسانے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح تخلیق کار پودے کی نشو و نما روک دینے پر نہ صرف اس پودے کو آنسو بہاتے دیکھ رہا ہے بلکہ خود بھی اس پر آنسو بہا رہا ہے۔ اسی طرح ہمارے معاشرے میں دولت کی حصولیابی کے لیے فرد کی بڑھوتری کو روک لیا گیا ہے اور طاقتور طبقہ اپنے سے کمزور طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی بڑھوتری کو روک کر انہیں بونسائی بنا رہے ہیں۔ اس افسانے کے حوالے سے ڈاکٹر ضیاء الحسن کہتے ہیں کہ "بونسائی میں اس معاشرے کا ہر فرد بونسائی ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔"[۷]

اس افسانے میں ایک اور پہلو جس پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ یہ ہے کہ فرد میں راتوں رات امیر بننے کی ہوس نے انسان کو تنہا کر دیا ہے۔ فرد کے لیے معیار زندگی بدل گئے ہیں اب امیر طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد نے گنجان شہروں کو چھوڑ کر نئی ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہنا شروع کر دیا ہے جہاں ایک فرد دوسرے فرد سے بالکل بیگانہ اور لاپرواہ ہے۔ پرانے وقتوں میں گھر کی حفاظت کے لیے بڑی بوڑھیاں آیت الکرسی پڑھ کر پھونکا کرتی تھیں مگر اب گھر کی حفاظت کے لیے جدید الارم سسٹم نصب کر دیے گئے ہیں۔

> "میری بیوی نے کتنی بار سمجھایا تھا کہ اس دیوار سے آگے آلارم سسٹم کی seeing eye ہے، یہ آلارم سسٹم ہمارے لئے ضروری ہے، مہنگا ہے تو کیا ہوا اس علاقے میں رہنے کے لیے It's a must ڈیفنس سوسائٹی میں جیسے جیسے فیز آگے بڑھتے جائیں گے اور آپ اس creek کی طرف بڑھتے جائیں گے، جیسے کوئی دن جاتا ہے کہ Fill کر لیا

جائے گا اور مکان بنانے کے لیے زمین مہنگی سے مہنگی داموں بکنے لگے گی زمین سونا بن
جائے گی اور لوگ اکیلے۔۔۔"[8]

آصف فرخی اپنے افسانوں میں بظاہر تو کراچی کے سماجی مسائل بیان کرتے ہیں مگر دراصل وہ پورے ملک کے سماجی مسائل ہیں۔ انہیں سماجی مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک اور پہلو کو اپنے افسانے "پرندے کی فریاد" میں یوں بیان کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں روزی کمانے کے نِت نئے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں یہاں بے زبان اور کمزور پرندوں کو قید کر کے بھی فروخت کیا جارہا ہے اور دوسروں کو ان پر رحم کھانے کی تلقین کر کے ان کے رحم کے عوض پیسے بٹورے جارہے ہیں۔ ان پرندوں کو قید دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان پنجروں میں پرندے قید نہیں ہیں بلکہ ہمارے معاشرے کے افراد قید ہیں جو اپنی بھوک اور پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہیں اس افسانے کو پڑھنے کے بعد ہم پر ایک اور حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے افسانے "پرندے کی فریاد" میں "پرندے اور پنجرے" کو استعاراتی معنوں میں استعمال کیا ہے جس طرح پرندے پنجرے میں قید ساکت بیٹھے ہیں اسی طرح اس شہر سے تعلق رکھنے والے افراد بھی اپنے ماحول میں پھیلی خوف اور دہشت کی فضا سے سراسیمہ ہو کر ساکت ہو گئے ہیں۔ پروفیسر مسکین احمد منصور اس افسانے کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

" یہ افسانہ اس شہر اور ملک کے خوف زدہ معاشرے کی عکاسی کرتا ہے شہر اور
معاشرے کی آزادی سلب ہو جائے تو یہی ہوتا ہے جس طرح پرندے پنجرے میں بند
ہیں اسی طرح اس شہر اور ملک کے انسان بھی۔"[9]

آصف فرخی کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی اپنے ارد گرد کے ماحول میں دیکھا اور محسوس کیا اسے افسانے کی صورت میں بیان کر دیا آصف فرخی کا تعلق چونکہ کراچی سے ہے۔ اس لئے ان کے زیادہ تر فسانوں کی کہانیوں کا تانا بانا کراچی اور کراچی میں رونما ہونے والے واقعات کے گرد بنا نظر آتا ہے۔

آصف فرخی بظاہر کراچی لیکن پورے ملک میں پھیلی خود غرضی کی فضا اور انسانیت کے خاتمہ کے مسئلے کو موضوع بناتے ہوئے اپنے افسانے "آج کا مرنا" میں بیان کرتے ہیں کہ آج کا انسان کس قدر خود غرض ہو گیا ہے خود غرضی کا یہ عالم ہے کہ اسے اپنے ارد گرد موجود انسانوں کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔ وہ اپنی زندگی میں

اس قدر مصروف ہے کہ اس کے ساتھ رہنے والا انسان کس حال میں ہے اسے اس کی کچھ خبر اور پروا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جہاں ہر وقت لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور وہاں ایک بوڑھی بھکارن صبح شام بیٹھی رہتی ہے اور بلیوں کو کھانا کھلاتی ہے۔ اس کے پاس ایک عمارت ہے جس میں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ایک دن صبح کے وقت مصنف کا وہاں سے گزر ہوا تو وہ مردہ حالت میں وہاں ہاتھ پھیلائے آنکھیں اوپر کی طرف مڑی ہوئیں پڑی تھی۔ مصنف اس عمارت کے ساتھ ہی موجود تھانے میں جب اس بڑھیا کی موت کی اطلاع کرنے گیا تو پولیس والے مصنف کی بات سن کر ہنسنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ پولیس سٹیشن نہیں بلکہ کرائم انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ ہے جہاں پر جرائم کی تفتیش کی جاتی ہے۔ مصنف یہ سب سن کر اور دیکھ کر بے حد مایوس ہوتا ہے کہ ہے جہاں رہنے کے اس نے خواب دیکھے تھے، وہاں لوگوں کی خود غرضی کا یہ عالم ہے کہ ایک انسان اپنی جان سے چلا گیا مگر کسی کو بھی اس کی پروا نہیں ہے۔ سب اپنی اپنی زندگی میں مگن ہیں انسان کی زندگی کی کوئی قدر نہیں رہی بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا ہمارے معاشرے میں انسانیت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

> "اتنے فاصلے سے مجھے یہی نظر آیا کہ بلیوں والی مائی شہر کے بیچوں بیچ اپنی اسی پرانی جگہ، تھانے اور سکول کے پاس بیٹھی ہوئی ہے اور اس کی پتلیاں ساکت ہیں۔ وہ اپنی موت تک پہنچ چکی ہے اور شہر اس کے گرد گول گول گھوم رہا ہے، چکّر کاٹ رہا ہے۔۔۔ کبھی کسی کے لیے نہ رُکنے والا، کبھی کسی کو یاد نہ کرنے والا۔۔۔ اسے موت کی کیا خبر۔"[۱۰]

آصف فرخی نے اپنے افسانوی مجموعے "میرے دن گزر رہے ہیں" میں اسی طرح کا ایک اور افسانہ "مرنا اگر ایک بار ہوتا" تحریر کیا ہے۔ اس افسانے میں بھی موت کی آفاقی حقیقت اور اس کے ساتھ شہر کی مصروف اور خود غرض زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہیں کہ اس شہر کو کسی کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس شہر میں چلنے والے افراد کسی کی موت کی پرواہ کئے بغیر اپنے دھندوں میں مصروف رہتے ہیں۔ "میرے دن گزر رہے ہیں" میں شامل مذکورہ بالا دونوں افسانے بالکل ایک جیسے ہیں ان کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایک ہی افسانہ کو مصنف نے دو دفعہ تحریر کر دیا ہے۔

ج۔ آصف فرخی کے منتخب افسانوں میں معاشی مسائل کا تجزیہ

کراچی کو پاکستان کا معاشی حب کہا جاتا ہے۔ قدرتی سمندری بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یہ شہر بہترین تجارتی مقام کی حیثیت اختیار کر گیا۔ یہاں ملک بھر سے لوگ تلاش معاش کے لیے آتے ہیں۔ صنعتی و تجارتی شہر

ہونے کے ناطے سے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پر یہاں کاروبار کے سلسلے میں بھی کاروباری حضرات آتے ہیں۔ مگر اسی کی دہائی سے شروع ہونے والے دہشت گردی کے واقعات اور فرقہ وارانہ ہنگاموں کے نتیجے میں ہونے والے قتل و غارت کے واقعات نے شہر کی معیشت کو بھی بری طرح نقصان پہنچایا۔ شہر میں ہونے والے ہنگاموں سے آئے دن ہونے والی ہڑتالوں سے تاجر طبقہ بری طرح متاثر ہوا۔ پر امن حالات جہاں افراد کو مکمل آزادی سے معاشرتی و سماجی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل بناتے ہیں وہی معاشی حوالے سے بھی فرد کو مستحکم ہونے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں فرد کی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہر موضوع کو اپنے افسانوں کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ اسی طرح کراچی میں رہنے والے افراد کے معاشی مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ زندگی گزارنے کے لئے روٹی، کپڑا اور مکان فرد کی بنیادی ضروریات ہیں اور ان میں روزی کمانا اہم ترین ضرورت ہے جس کے بل بوتے پر انسان کی باقی دونوں ضرورتیں بھی پوری ہوتی ہیں۔

آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں کراچی میں ہونے والے ہنگاموں اور ان کی وجہ سے شہریوں کو درپیش مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے معاشی مسائل کو بیان کیا ہے۔ افسانہ "بلڈ بینک" میں شہر میں آئے روز برپا ہونے والے ہنگاموں کے نتیجے میں شہر کو بند کر دیا جاتا ہے ایسا لگتا ہے کہ شہر سانس روکے کھڑا ہے۔

> "کیا لوگ دفتروں اور دکانوں پر پہلے کی طرح جانے لگے؟ شہر معمول پر آگیا؟ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا پھر میں نے سوچا اس شہر کا کچھ پتہ بھی تو نہیں چلتا۔ ابھی کہیں ہنگامہ دوبارہ پھوٹ پڑا تو پھر پہلے کی طرح مصیبت ہو جائے گی۔""

پچھلی کچھ دہائیوں سے شہر کے بگڑے ہوئے حالات کی وجہ سے کراچی میں موجود کاروباری طبقہ بھی بری طرح متاثر ہوا ہے۔ آئے دن کے ہنگاموں کی وجہ سے یا تو دکانیں بند کروا کر ہڑتالیں کر دی جاتی ہیں یا پھر شہر میں موجود شر پسند عناصر موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کاروباری حضرات کو لوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ افسانہ "اس میں ظالم بوئے خوں راہ ہے" اور "دستنبو" میں اسی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے کہ شہر کے حالات اس قدر نازک اور گھمبیر ہیں کہ نہ کوئی بینک محفوظ ہے نہ دوکانیں اور نہ ہی کاروباری افراد یا تو انہیں ڈاکہ ڈال کر لوٹ لیا جاتا ہے یا ان کے کاروبار بند کروا دیئے جاتے ہیں اور یہ بھی نہ ہو تو انہیں قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا اور اس ساری صورتحال کے آگے سب بے بس ہیں۔

"یہ اس دن کی بات ہے جب طارق روڈ پر پر جو زیورات کی بڑی دکان ہے اس پر ڈاکہ پڑا تھا۔ کون ساڈاکہ؟ وہی جس کے فورا بعد دوکانداروں نے احتجاج میں سارا بازار بند کر دیا تھا اس سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔"[۱۲]

شہر کے حالات کے ہاتھوں ہر شخص بے بس اور مجبور نظر آتا ہے عام معصوم شہری شہر میں موجود منفی قوتوں کے ہاتھوں لٹ رہے ہیں چاہے وہ ڈاکہ کی صورت میں ہو یا بھتے کی صورت میں یا اغواء برائے تاوان کی شکل میں کراچی میں کاروبار کرنا ممکن نہیں رہا کیونکہ جب کاروبار اور کاروباری افراد کو تحفظ فراہم نہیں ہو گا تو ایسے میں کوئی کیسے اس شہر میں اپنا سرمایہ لگائے گا اور کیسے شہر معاشی طور پر مستحکم ہو گا۔ ایسے میں عوام اور کاروباری حضرات دونوں معاشی پریشانی کا شکار ہیں۔ یہی صورتحال نوکری پیشہ افراد کی بھی ہے جب شہر میں کاروبار بند ہو گا تو نئے روزگار کہاں سے ملیں گے۔ افسانہ "ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق" میں آصف فرخی نے کراچی کے حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے روزگاری کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ وہ شہر جہاں ملک بھر سے لوگ روزگار کی تلاش میں آتے تھے وہاں امن وامان کی خرابی نے روزگار کے مواقع بھی کم کر دیئے ہیں۔

"ضمیر تمہاری نوکری کا کچھ ہوا؟ انہوں نے پوچھا۔ مجھے لگا کہ آج کل شہر میں چلنے والی ہوا بھی مجھ سے یہی سوال پوچھ رہی ہے۔ "جی نہیں" میں نے مختصر جواب دیا۔ پھر کچھ امید ہے؟ "اب دیکھیے شہر میں جو ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے ایسے میں کیا امید رکھی جاسکتی ہے؟" میں نے کوشش کی کہ ان کے سوال کا صحیح طور پر جواب دوں۔"[۱۳]

مذکورہ بالا کراچی کے افراد کے معاشی مسائل اس وقت کے ہیں جب اسی کی دہائی کے بعد شہر میں افغان مہاجروں کو پناہ دی گئی جس کے بعد شہر بھر نے سکھ کا سانس نہیں لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کراچی کے شہریوں نے پہلی دفعہ کلاشنکوف اور رائفل ایسے کھلے عام دیکھی تھی پھر اس کے بعد تو اسلحے کی وہ نمائش اور استعمال ہوا کراچی شہر میں کہ جس سے کراچی میں رہنے والا کوئی فرد محفوظ نہ رہ سکا۔ ملک دشمن قوتوں نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کراچی کی معیشت کو بُری طرح نقصان پہنچایا۔ بہت سے کاروباری حضرات اپنے کارخانے، ملیں اور کاروبار لپیٹ کر دوسرے صوبوں اور شہروں میں لے گئے۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب کراچی میں رہنے والا خاص اور عام انسان معاشی حوالے سے خود کو انتہائی غیر محفوظ اور غیر مستحکم محسوس کر رہا تھا ایک لمبے عرصے سے شروع اس ہنگامہ خیز صورتحال پر رینجرز کی مدد سے بالآخر قابو پالیا گیا۔ اب کراچی دوبارہ سے اللہ کے رحم و کرم سے مکمل طور پر پُر امن شہر بن چکا ہے نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سرمایہ کار بھی کراچی میں سرمایہ کاری کر

رہے ہیں۔ جس سے کراچی میں رہنے والے افراد کو روز گار کے نت نئے مواقع فراہم ہو رہے ہیں۔ مگر جہاں سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے اور کراچی کی معیشت مستحکم ہو گئی ہے وہیں بہت سے افراد کچھ معاشی و تجارتی پالیسیوں سے بھی متاثر ہو رہے ہیں خاص طور پر نچلے طبقے کے مزدور پیشہ افراد بہت سے تجارتی منصوبوں کی وجہ سے اپنا روز گار کھو رہے ہیں۔

آصف فرخی نہایت باریک بین اور حساس لکھاری ہیں انہوں نے اپنے افسانوں میں جہاں بڑے تاجر افراد کے کاروباری مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے وہیں کراچی کے نچلے طبقے کے مزدور پیشہ افراد کے معاشی مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔ آپ اپنے افسانے "شہر تہہ آب" میں سمندر کنارے ساحل پر بننے والے بڑے بڑے ریستوران اور رہائشی اسکیم کے تحت بننے والی عمارتوں کی وجہ سے ساحل کے کنارے اونٹ کی سواری کروانے والوں کا روز گار تقریباً ختم ہو گیا ہے کیونکہ ان بڑے بڑے ہوٹلوں کے مالکان انہیں اپنی رستوران کے سامنے یہاں تک کہ ارد گرد بھی بھٹکنے نہیں دیتے۔ ساحل سمندر آہستہ آہستہ ان کاروباری مراکز سے بھرتا چلا جارہا ہے ایسے میں وہاں اونٹ والوں کی جگہ کہاں۔

> "اونٹ والے نے کہا کہ اگر ان کے اونٹ اس فاسٹ فوڈ ریستوراں کے قریب آجائیں تو یہ لوگ مارتے ہیں، انھوں نے چھڑیاں اور ڈنڈے رکھے ہوئے ہیں، قریب بھی نہیں بھٹکنے دیتے۔ ساحل کا یہ حصہ اونٹ والوں کو چھوڑنا پڑا ہے۔"[۱۴]

ساحل سمندر پر تفریح کرنے والے جہاں اونٹ کی سواری سے محروم ہو رہے ہیں وہیں ان تفریح فراہم کرنے والوں کا روز گار بھی ختم ہو رہا ہے۔ نہ صرف یہ ساحل سمندر ہونے والی ان تعمیرات کی وجہ سے عام انسان کی ساحل سمندر تک رسائی مستقبل قریب میں ناممکن نظر آرہی ہے۔ وہیں چھوٹے چھوٹے مزدور پیشہ افراد کا معاشی مستقبل بھی خطرے میں ہے۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی سمندر میں جانے والے شہر بھر کے گندے پانی ،بے ڈھنگی منصوبہ بندی اور تجاوزات ماہی گیری کے پیشے کو بھی خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ ساحل سمندر آباد کچی آبادی والوں کا واحد روز گار ماہی گیری ہے مگر دن بدن سمندر کنارے بننے والے رہائشی منصوبے نہ صرف سمندری مخلوق بلکہ مچھیروں کے روز گار کے لئے بھی ایک بڑا خطرہ ہیں۔ حکومت جہاں بڑے کاروباری افراد کو کاروبار کے مواقع دے کر شہری و ملکی معیشت کو فروغ دے رہی ہے وہیں انتظامیہ کو چاہیے کہ چھوٹی سطح کے مزدور پیشہ افراد کے لیے بھی روز گار کو محفوظ بنانے کے لیے عملی اقدامات اٹھائے۔

اسی طرح افسانہ "بونسائی" میں آصف فرخی نے دور جدید کے انسان میں روز بروز بڑھتے معاشی استحکام کے بھوت کو بھی بے نقاب کرتے نظر آتے ہیں۔ مصنف کے مطابق ہمارے معاشرے میں رہنے والا ہر فرد خود کو معاشی طور پر مستحکم بنانے کی دوڑ میں ہے اور اس دور میں اپنے سے کمزور نچلے طبقے کو روندتا کچلتا چلا جارہا ہے۔ ہمارے معاشرے کے طاقتور افراد معاشرے کے کمزور افراد کی نشو نما کو روک رہے ہیں اور فرد بونسائی بن رہا ہے۔ آصف فرخی اپنے افسانوں میں بظاہر تو کراچی میں رہنے والے فرد کو پیش نظر رکھ کر اس کے مسائل کو بیان کرتے نظر آتے ہیں مگر دیکھا جائے تو وہ صرف کراچی شہر میں رہنے والے فرد کے مسائل نہیں بلکہ پورے ملک کے ہر شہر میں رہنے والے فرد کے مسائل ہیں۔ آپ اپنے افسانے "پرندے کی فریاد" میں کراچی کے فرد کو درپیش معاشی مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نکتے کو بیان کرتے ہیں کہ معاش کے حصول نے انسان کو اس قدر مجبورولاچار کر دیا ہے کہ وہ معاش کی خاطر ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔ وہ اپنی روزی روٹی کمانے کے لئے بے زبان معصوم پرندوں کو قید کر کے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو ان سے ہمدردی کرنے اور انہیں خرید کر آزاد کرنے پر ثواب کمانے کی ترغیب کرتا ہے جبکہ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے انہی معصوم پرندوں کو قید کر دیتا ہے۔

"لے لو بابو، یہی تین دانے رہ گئے ہیں۔۔۔ اس آدمی کے لہجے میں التجا تھی۔ پرندوں کی نہیں، اسکی اپنی مجبوری۔۔۔ بے زبان ہیں دعا دیں گے۔۔۔ وہ ایک کے بعد ایک گنوائے جارہا تھا مگر میں نے اس کی طرف نہیں پرندوں کی طرف دیکھا۔۔۔ میں نے ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے نوٹ کا رنگ آنکھیں پھاڑ کر دیکھا پھر نوٹ اس نے جھپٹ کر مٹھی میں بھر لیا اور پرندوں کا پنجرہ ادھ کھلے شیشے میں سے تقریباً ٹھونس دیا۔"[۱۵]

مذکورہ بالا افسانے میں افسانہ نگار نے ایک نقطے کو پرندے اور پنجرے کے ذریعے بیان کیا ہے کہ اس پنجرے میں پرندے نہیں بلکہ افراد معاشرہ قید ہوئے ہیں اور یہ پنجرہ ان قید افراد کے گرد معاشی و سماجی مجبوریاں کا ہے۔ ان سماجی و معاشی مجبوریوں نے فرد کو قید کر رکھا ہے اور وہ چاہ کر بھی ان سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔

المختصر یہ کہ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں کراچی شہر کے ان سنجیدہ اور اہم مسائل کی طرف قاری کی توجہ دلائی ہے جو کہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ پاکستان کے تقریباً ہر شہر کے مسائل ہیں ان مسائل کو جاننے کے بعد ہمیں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کراچی جیسے میٹروپولیٹن شہر میں ایک عام فرد یا شہری کی زندگی کیسی

ہے اور اس کو کونسے مسائل لاحق ہیں اور مزید یہ کہ ان مسائل کی وجہ سے اس کی زندگی کیسے متاثر ہو رہی ہے اور اس کی نفسیات پر وہ مسائل کیسے اثر انداز ہو رہے ہیں۔ آصف فرخی کے افسانوں کا کراچی کے انفرادی مسائل کے تناظر میں مطالعہ کرنے کے بعد قاری یہ جاننے کے قابل ہو جاتی ہے کہ کراچی ملک کا سب سے بڑا شہر ہے مگر اس میں رہنے والا فرد بھی نفسیاتی، سماجی اور معاشی مسائل کا اسی طرح شکار ہے جیسے ملک کے کسی اور حصے میں رہنے والا فرد ہے۔

الغرض آصف فرخی کے افسانوں کے تناظر میں اگر کراچی میں رہنے والے فرد کے نفسیاتی، سماجی اور معاشی مسائل کو دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فرد نفسیاتی طور پر خود کو شہر کے حالات کے سامنے بے بس اور مجبور تصور کر رہا ہے۔ وہ خود کو اس قدر کمزور محسوس کر رہا ہے کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی بھی جرات نہیں رکھتا۔ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی وہ خود پر ایک عجیب خوف اور اضطراب کو سوار کیے ہوئے ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ بظاہر آزاد ہوتے ہوئے بھی خود کو قید سمجھتا ہے۔ آصف فرخی کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض افسانے نہیں بلکہ آپ بیتیاں ہیں۔ اسی طرح شناخت کی گمشدگی، دن بدن بڑھتی دولت کی ہوس اور انسانیت کے خاتمے جیسے موضوعات کو جس طرح افسانے کے قالب میں ڈھالا گیا ہے وہ بھی قابل تعریف ہے۔

شناخت کی گمشدگی نے فرد کو اپنی اقدار اور روایات سے دور کر دیا ہے اور جب انسان اپنی روایات کو بھلا دیتا ہے تو وہ بے وقعت ہو جاتا ہے روایات ہی انسان کو اس کے اصل کے ساتھ جوڑے رکھتی ہیں۔ اسی طرح روز بروز بڑھتی دولت کی ہوس نے انسان کو اس قدر خود غرض بنا دیا ہے کہ وہ اپنے سے کمزور طبقہ کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے پیس رہا ہے مگر اسے اس کا کوئی احساس نہیں۔ آصف فرخی اپنے معاشرے کے مسائل کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف کراچی شہر کے سماجی مسائل نہیں ہیں بلکہ پورے ملک کے مسائل ہیں۔ آپ نے اپنے افسانوں میں نہ صرف کراچی کے موجودہ مسائل کو بیان کیا ہے بلکہ مستقبل میں پیش آنے والے مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے تا کہ قارئین کو موجودہ حالات کے نتائج سے باخبر کیا جا سکے یعنی انہوں نے محض سامنے کے حالات کو اپنے افسانوں کا موضوع نہیں بنایا بلکہ مستقبل کی پیش گوئی بھی کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آصف فرخی، شہر بیتی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص؛۱۲۰۔۱۲۱۔

۲۔ ایضا، ص؛۱۳۹۔

۳۔ آصف فرخی، شہر ماجرا، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص؛۱۱۔

۴۔ ایضا، ص؛۱۲۸۔

۵۔ آصف فرخی، میرے دن گزر رہے ہیں، شہر زاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص؛۱۵۔

۶۔ آصف فرخی، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا، فضلی سنز پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص؛۱۵۔

۷۔ رخسانہ پروین، آصف فرخی کی کہانی، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۹، ص؛۷۰۔

۸۔ آصف فرخی، میرے دن گزر رہے ہیں، شہر زاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص؛۲۲۔

۹۔ مسکین احمد منصور، پروفیسر، آصف فرخی کے دو افسانے، مشمولہ: شعر و حکمت، جلد اول، حیدر آباد انڈیا، جولائی ۲۰۱۰، ص۱۲۳۔

۱۰۔ آصف فرخی، میرے دن گزر رہے ہیں، شہر زاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص۵۷۔

۱۱۔ آصف فرخی، شہر بیتی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص۲۶۔

۱۲۔ ایضاً، ص۴۲۔

۱۳۔ آصف فرخی، شہر ماجرا، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص۴۵۔

۱۴۔ آصف فرخی، میرے دن گزر رہے ہیں، شہر زاد پبلشرز، ۲۰۰۹ء، ص۱۶۹۔

۱۵۔ ایضاً، ص۸

باب سوم

آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے اجتماعی مسائل کا تجزیہ

الف: آصف فرخی کے منتخب افسانوں میں کراچی کے سیاسی وانتظامی مسائل کا تجزیہ

کراچی کاسمو میٹروپولیٹن شہر ہونے کے ساتھ ساتھ تضادات کا منظر نامہ بھی ہے اس میں بیک وقت دو شہر آباد ہیں۔ایک شہر ایسے لوگوں کا ہے جو کہ مالی لحاظ سے خوشحال ہیں لہذا شہر کا یہ حصہ ویڈیو کلچر،برقی روشنیوں میں نہایا ہوا اور کئی منزلہ پرستائش رہائشی منزلوں اور پرکشش ترقیاتی وتجارتی منصوبوں کا نمائندہ ہے۔جبکہ کراچی کا دوسرا حصہ جس سے ہم میں سے بہت سے پاکستانی بے خبر ہیں اور اکثر دیکھنے کے باوجود نظر انداز کر دیتے ہیں وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بچوں کا شہر ہے جہاں کی کچی،ٹوٹی پھوٹی گلیاں، ابلتے گٹر اور نالے، ایک کمرے کے مکان میں درجنوں افراد ٹھنسے ہوئے، بدبودار اور شوروغل سے بھرپور شہر ہے۔ کراچی شہر میں بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے بنیادی سہولتوں کا حصول بحران کا شکار ہے۔ کراچی کو پچھلی کئی دہائیوں سے بہت سے مسائل کا سامنا ہے ان میں صاف پینے کے پانی کا مسئلہ، سیوریج کا نظام،ٹریفک کا نظام، کوڑا کرکٹ کے ڈھیر، لینڈ مافیا، غیر قانونی تجاوزات، منصوبہ بندی کے بغیر عمارتوں کی تعمیر اور ٹوٹی پھوٹی سڑکیں وغیرہ جیسے بہت سے مسائل شامل ہیں۔ کراچی کو دنیا کا ساتواں بڑا شہر مانا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے اس شہر کا شمار دنیا کے ان دس بڑے شہروں میں ہوتا ہے جہاں ایک اچھی زندگی گزارنا عام آدمی کے لیے تقریباً ناممکن ہے کیونکہ ہر سال آبادی میں تیزی سے ہونے والے اضافہ کے ساتھ عام آدمی کیلئے بنیادی سہولتوں کی فراہمی میں کمی میں بھی اضافہ مسلسل دیکھنے کو مل رہا ہے اور ایسے میں شہر کے اعلی اہل کار اور انتظامیہ خاموش تماشائی دکھائی دیتے ہیں۔

آصف فرخی کا تعلق چونکہ کراچی سے ہے انہوں نے اپنی تمام زندگی کراچی میں بسر کی وہاں کی آب وہوا اور بدلتے منظر نامے کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ آپ پیشے کے اعتبار سے طبی ڈاکٹر ہیں زندگی نے انہیں موقع بھی دیا کہ وہ اس شہر کو چھوڑ کر دنیا کے کسی ترقی یافتہ شہر میں زندگی بسر کریں مگر انہوں نے دنیا کے کسی ترقی یافتہ شہر پر کراچی کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے شعبے میں اسپیشلائزیشن کرنے کے بعد دوبارہ پاکستان واپس آگئے۔ آصف فرخی کی اپنے شہر سے محبت اور عقیدت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کوئی اور ہو ہی

نہیں سکتا جہاں آج پاکستانی نوجوان اپنے مستقبل کو سنوارنے اور خاندان کو بہتر مستقبل اور زندگی دینے کے لیے یورپی ممالک کا رُخ کرتا ہے ایسے میں آصف فرخی نے پاکستان میں اپنی زندگی بسر کرنے اور اپنی خدمات پیش کرنے کو ترجیح دی۔ آصف فرخی نے کراچی اور اس میں بسنے والے لوگوں کو درپیش مسائل کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے اور ان مسائل کو جس طرح اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے اس تکلیف، کرب اور ان الفاظ کے پس پردہ جذبات کو ایک درد دل رکھنے والا ہی سمجھ سکتا ہے۔

" میرے دن گزر رہے ہیں" افسانوی مجموعے میں شامل تمام کہانیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ تمام تر کہانیاں آصف فرخی کے کراچی میں گزرنے والے شب و روز کے حوالے سے ہیں گویا یہ کہانیاں نہیں بلکہ کراچی میں رہنے والے افراد کی آپ بیتیاں ہیں۔ افسانہ "شہر تہہ آب" میں شہر میں سیوریج اور پانی کی نکاسی کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کراچی جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے اور اگر کبھی آسمان پر کالے بادل منڈلانے لگیں تو شہری خوش ہونے کے بجائے اس فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کہیں یہ بارش رحمت کی بجائے ان کے لئے زحمت ہی نہ بن جائے۔ یہ فکر کراچی میں رہنے والوں کے لیے کچھ غلط بھی نہیں ہے شہر بھر میں پانی کی نکاسی کا نظام مفلوج ہو چکا ہے۔ جگہ جگہ گٹر اُبل رہے ہیں۔ شہر میں موجود نالے کوڑا کرکٹ کی وجہ سے اپنا کام کرنا تقریباً بند کر چکے ہیں جس کی وجہ سے شہر بھر کا پانی نالوں میں جانے کے بجائے گٹروں سے اُبل اُبل کر پورے شہر میں پھیل جاتا ہے۔ ایسے میں جب بارش ہوتی ہے تو نہ صرف بارش کا پانی بلکہ گٹروں کا گندا پانی بھی اس میں شامل ہو کر شہریوں کے گھروں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ رات میں ہونے والی بارش کے دوران آدھی رات کو جب مصنف کی آنکھ کسی آواز پر کھلتی ہے اور وہ بیڈ سے نیچے پاؤں رکھتا ہے تو اسے کچھ گیلا گیلا احساس ہوتا ہے اور ساتھ ہی اسے اپنے پاؤں کے ساتھ کوئی لیس دار چیز چپکتی محسوس ہوتی ہے ایسے میں وہ اپنی بیوی کو جگاتا ہے تو وہ اسے بتاتی ہے کہ گھر میں بارش کے پانی کے ساتھ گٹر کا پانی بھی داخل ہو گیا ہے ساتھ ہی انہیں اپنے ماحول میں پھیلی سیلی ہوئی ہوا کے ساتھ تعافن کے جھونکے بھی محسوس ہونے لگتے ہیں۔ بارش کے ساتھ ساتھ بجلی بھی چلی گئی ہے۔ گھر میں موجود تمام فرنیچر، قیمتی کپڑے سب اس گندے پانی کی نذر ہو گئے نہ صرف یہ بلکہ دفتر میں موجود لوگ اس انتظار میں ہیں کہ بارش کچھ تھمے تو وہ گھروں کی جانب رخ کریں مگر ساتھ ہی یہ فکر بھی لاحق ہے کہ گھر جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جائے کیوں کہ اس بارش کی وجہ سے سڑکیں پانی میں گھٹنوں گھٹنوں تک ڈوبی ہوئی ہیں کوئی جائے

تو کہاں جائے۔ شہری انتظامیہ نے شہر کو ترقی دینے کیلئے جو انڈر پاس تعمیر کیا تھا اس میں بھی گھٹنوں گھٹنوں پانی جمع ہے۔

"مین روڈ تک پانی بھر گیا ہے۔ دو تلوار سے لے کر وہ نئی والی سرنگ تک پانی بھر گیا ہے۔۔۔وہ جو سڑک کے نیچے سے سڑک نکالی ہے۔۔۔راستہ بند ہے۔۔۔۔"

"ہم پھنس کر رہ گئے ہیں۔۔۔۔اس نے صاحب کی طرف رخ کرکے کہا۔"وہ تو شکر ہے رات کو کسی کو ضرورت نہیں پڑی باہر جانے کی۔ اگر کوئی ایمرجنسی ہو جاتی تو ہم کیا کرتے؟"ایمرجنسی صاحب کی گٹھی گٹھی آواز آئی۔" ہمارا صوفہ اور قالین تک تیر گیا ہے۔ نیچے کی منزل میں سارا گٹر کا پانی بھر گیا ہے۔ میری بیوی کہہ رہی ہے، قالین میں سے مرے ہوئے چوہے کی بدبو آ رہی ہے۔ بجلی آپ کی طرف بھی نہیں ہے؟ آپ کا تو کھمبا الگ ہے۔"[1]

شہر میں پانی کی نکاسی کے نظام کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل اس قدر خوفناک صورت اختیار کر چکے ہیں کہ چند گھنٹوں کی معمولی نوعیت کی بارش بہت سے افراد کے لئے وبال جان بن گئی ہے ایسے میں شہر کے اعلی اہلکار، سیاستدان اور انتظامیہ کوئی سنجیدہ ردعمل دینے کی بجائے ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو انتخابات کے دنوں میں عوام کو ہر بنیادی سہولت دینے کا وعدہ کرتے ہیں مگر کرسی ملتے ہی ایسے آنکھیں پھیر لیتے ہیں جیسے اس عوام سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ عوام ان مسائل کی وجہ سے اس قدر پریشان ہے کہ وہ نہیں جانتی کہ ان مسائل سے انہیں چھٹکارا کیسے ملے گا اور سیاستدان ہیں کہ ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے نہیں تھکتے۔

"طاہر نے گاڑی کے ایف ایم ریڈیو کی آواز تیز کر دی۔ شہر کے ایک اعلیٰ اہلکار کا انٹرویو آ رہا تھا۔"حالات معمول کے مطابق ہیں شہر میں صرف تین انچ بارش ہوئی ہے۔ ہماری مخالف سیاسی تنظیم کے کارکنوں نے گٹر لائنیں چوک کر دی ہیں، یہ ہمیں رسوا کرنے کی سازش ہے۔۔۔"[2]

کراچی پاکستان کا وہ شہر ہے جو ملک کو تقریباً پچھتر فیصد سالانہ ریونیو دیتا ہے اسے ملک کا معاشی حب بھی کہا جاتا ہے مگر اس کی ترقی و خوشحالی کے لیے نہ صوبائی حکومت کام کرنے کو تیار ہے نہ انتظامیہ اور نہ ہی وفاقی

حکومت۔ آصف فرخی اپنے افسانے "شہر تہہ آب" میں بارش کے نتیجے میں شہر بھر کی صورتحال اور ان حالات کے پیش نظر انتظامیہ اور بلدیاتی اداروں کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے نظر آتے ہیں مگر بدقسمتی سے آج بھی شہر قائد کے حالات جوں کے توں ہیں ۲۰۲۰ء میں ہونے والی مون سون کی بارشوں کے نتیجے میں شہریوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا نہ صرف یہ بلکہ بہت سے لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اس حوالے سے مظہر عباس اپنے کالم "لاوارث" میں لکھتے ہیں کہ

> "مائیں اکثر اپنے بچوں کی نظر اتارتی ہیں مگر یہ سب ان بچوں اور بچیوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کے وارث ہوتے ہیں مگر یہ تو ایک "لاوارث" ہے اپنا نام کراچی بتاتا ہے ہر بار ڈوبتا ہے اور پھر ابھرتا ہے اور اپنے وارث کو تلاش کرنے نکل پڑتا ہے۔اس بار ایک قیامت سی گزر گئی اس پر۔ہر شخص کی اپنی کہانی ہے کیا سرجانی اور کیا ڈیفنس، کیا کورنگی اور کیا اورنگی۔ پتہ نہیں کس کس کی برسوں کی جمع پونجی ان بارشوں میں بہہ گئی پانی اترا تو سڑکیں بھی بہہ گئیں۔ بجلی کے تار کھمبوں سے زمین پر آ گئے، نہ جانے کتنوں کو کھا گئے، گلیوں میں کھیلتے نہ جانے کتنے بچے نالوں میں ڈوب کر کھو گئے۔ کوئی ہے جو ان سے حساب لے،اس سب کا مگر میں تو لاوارث ہوں میری پرواہ کسے ہوگی۔"[۳]

یعنی حد ہی ہو گئی اس شہر کی یہ حالت ایک یا دو سال سے نہیں ہے بلکہ یہ شہر کئی دہائیوں سے مسلسل تباہی اور بربادی کا شکار ہو رہا ہے اور کوئی اس کو پوچھنے والا نہیں۔ آصف فرخی نے ایک محب وطن شہری اور درد دل رکھنے والے لکھاری ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے افسانوں میں اس مسلسل کرب اور تکلیف میں مبتلا کراچی کی عوام کے جذبات کو زبان دی ہے۔ آصف فرخی کے افسانوں میں بیان کیے گئے کراچی کے انتظامی و سیاسی مسائل حرف بہ حرف حقیقت پر مبنی ہیں۔ٹی وی، اخبارات، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا ہر جگہ کراچی کے ان مسائل کو عوام کی جانب سے اور سماجی شخصیات کی جانب سے وقتاً فوقتاً اجاگر کیا جاتا رہتا ہے مگر سندھ کی سیاسی جماعتیں، اعلیٰ اہلکار، انتظامیہ اور وفاقی حکومت اس سب کے باوجود چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ جہاں بارش کے باعث گندہ پانی گھروں میں داخل ہو رہا ہے وہی دوسری طرف کراچی کی آدھے سے زیادہ عوام صاف پینے کے پانی کی فراہمی سے محروم ہے۔ایسی صورت میں عوام پیسے دے کر واٹر ٹینکرز کے ذریعے گزارا کر رہی ہے ۔سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر عام صارفین کو پانی نہیں مل رہا تو یہ واٹر ٹینکرز والے کہاں سے پانی پیدا کر کے پورے شہر کو پانی فراہم کر رہے ہیں۔ آصف فرخی اپنے افسانے "آج کا مرنا" میں پانی کے اس مسئلے پر بھی

روشنی ڈالتے ہیں۔ پانی کی کمی اور سیوریج کے نظام کی خرابی کے ساتھ ساتھ ایک اور بڑا مسئلہ جو کراچی کی عوام کو درپیش ہے وہ آبادی میں مسلسل اضافے کی وجہ سے پیدا ہونے والے زمینی مسائل کا ہے شہر میں آبادی کا تیزی سے اضافہ بہت سے مسائل کو جنم دے رہا ہے۔

انتظامیہ اور بلدیاتی ادارے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔ افسانہ "اسلام علیکم یا اہل القبور" میں کراچی میں بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے زمین کی کمی اور اراضی کی غیر منصوباتی تقسیم اور لینڈ مافیا جیسے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کراچی جیسے گنجان آباد شہر میں زندہ انسانوں کو تو زمینی مسائل درپیش ہیں ہی مگر اب مردوں کیلئے بھی زمین تنگ ہو چکی ہے قبرستان میں قبروں پر قبریں بنائی جارہی ہیں۔ قبرستان جسے پہلے سکون کی جگہ سمجھا جاتا تھا اب بظاہر یہ وہ جگہ نہیں رہی۔ میت کے لواحقین قبر کے لیے جو جگہ گورکن سے مہنگے داموں خریدتے ہیں تو یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ خریدی گئی زمین میں صرف انہی کا مردہ دفن ہے بلکہ زیادہ تر تو ایک قبر کے اوپر دوسری قبر تیار کر دی جاتی ہے۔ ایک مردہ خاک میں مل گیا تو چند دن بعد اسی قبر میں دوسرے مردے کو دھانس دیا جاتا ہے۔ کراچی میں زمین کی الاٹمنٹ میں بڑی بڑی بے قاعدگیاں ہو رہی ہیں اور زمین پر ناجائز قبضہ کرنا باقاعدہ پیشہ بن گیا ہے۔ ایسے میں زندوں کے لیے جگہ نہیں رہی تو مردوں کے بارے میں کون سوچے گا۔

> "اس خط پر میں سب صاحب دل لوگوں کے دستخط لوں گا۔ میں صاف صاف لکھ دوں گا کہ جناب والا، روشنیوں کے شہر میں شہر خاموشاں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی ہے۔ کراچی کے قبرستانوں کی حالت شرمناک حد تک ناقابل برداشت ہے۔ گندے نالے کا سارا پانی اس قبرستان کے بیچ میں سے گزرتا ہے۔ گندے نالے کی عفونت ارے معاذ اللہ، اوراس پر مکھی مچھروں کی یلغار الامان والحفیظ! قبریں زمین میں آدھی آدھی دھنس گئی ہیں۔ یہ بدمعاش گورکن زمین کے ایک ہی ٹکڑے کو نہ جانے کتنی کتنی بار بیچ ڈالتے ہیں۔"[۴]

گندگی اور غلاظت کے ڈھیر نے قبرستانوں کو بھی نہیں چھوڑا سیوریج کے نظام کی خرابی نے قبروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے جس کی وجہ سے گندگی زمین کی تہہ میں اتر گئی ہے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ شہر کا بلدیاتی نظام سخت بحران کا شکار ہو چکا ہے اور اس سے نہ صرف زندہ شہری متاثر ہو رہے ہیں بلکہ مردوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

آصف فرخی نے افسانہ "مائی کولاچی" میں وی آئی پی مومنٹ کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح شہر میں ایک شخص کو تحفظ دے کر باقی شہر کے ہزاروں افراد کو دہشتگردی اور مشکل کا نشانہ بنایا جاتا ہے نہ صرف یہ بلکہ شہر کی حالت ناگفتہ بہ ہے مگر شہر کی سیاسی شخصیات وہی جانے پہچانے چہرے ہر بار ایک نئے ڈھنگ سے عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ میگا سٹی پروجیکٹ کے نام پر عوام سے جھوٹے وعدے کیے جاتے ہیں عوامی پیسے سے یہ شخصیات اپنے حالات تو سنوار لیتے ہیں جبکہ شہر کے حالات جوں کے توں رہتے ہیں۔ شہر کے کسی علاقے کو پہچاننے کے لئے سڑک کے ساتھ ساتھ آدھی سڑک کو گھیرے ہوئے ملبے کے ڈھیر اور سڑک پر گندے پانی کے تالاب کو دیکھتے ہی فوراً پتا چل جاتا ہے کہ یہ شہر کا کونسا علاقہ ہے جہاں ایک میگا پروجیکٹ حال ہی میں مکمل ہوا ہے جس کی خبر اخبار کے پورے رنگین صفحے پر اشتہار کی صورت میں دے دی گئی ہے۔ افسانوی مجموعہ "میں شاخ سے کیوں ٹوٹا" شامل افسانہ "رکے ہوئے لوگ" میں وی آئی پی کلچر اور اس کے ساتھ شہر بھر میں روز بروز بڑھتی ہوئی ٹریفک کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "آج رش کچھ زیادہ لگ رہا ہے۔۔۔ یہ آج کی بات نہیں ہے اس شہر کا اب یہی حال ہو گیا ہے۔ سلمان نے جواب دیا جدھر جاؤ سڑکیں ابلی پڑی ہیں۔"[۵]

آبادی میں اضافے کی وجہ سے ٹریفک بڑھتا جا رہا ہے مگر اس کے حل کے لیے نئی سڑکوں کی تعمیر کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی اور وی آئی پی شخصیات کا گزر شہریوں کی پریشانی میں مزید اضافے کا سبب بنتا ہے اور یہ شہر کی بڑی بڑی شخصیات عوام کو جھوٹے دلاسے دینے کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ ان سیاسی شخصیات نے شہریوں کی زندگی کو اجیرن کر رکھا ہے عوام سے جن کاموں کے وعدے، عوام سے ووٹ لینے کے وقت کیے جاتے ہیں وہ کام سیاسی فائلوں میں بند ہی رہتے ہیں اور عوام کو ہمیشہ کی طرح سبز جھنڈی دکھا دی جاتی ہے۔ "مکاشفہ عہد جدید" میں شہری انتظامیہ اور سیاسی اہلکار کے دوغلے رویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے آصف فرخی ایک ذہین لکھاری ہیں ان کے افسانے اپنے اندر ایک مقصد لیے ہوئے ہیں اور وہ اپنے افسانوں کے ذریعے کسی بھی سچائی سے پردہ اٹھانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ وہ اپنے افسانوں میں جہاں کراچی شہر کی انتظامیہ کی غفلت سے پیدا ہونے والے بہت سے مسائل کا تذکرہ کرتے ہیں وہی کراچی شہر میں جابجا زمین کے غیر قانونی قبضے، تجاوزات اور حکومت کی طرف سے قانونی مگر بے ڈھنگی منصوبہ بندی جو کہ شہریوں کے مستقبل کے لیے خطرہ بننے والے نکتوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ کراچی شہر کو قدرت کی طرف سے قدرتی سمندری بندر گاہ کا بیش بہا قیمتی تحفہ قدرت کی طرف سے ملا ہے، مگر افسوس کہ ہمیں اسکی قدر نہیں ہے۔ زہریلے پانی سے تو ہم پہلے ہی سمندر

کو کھو رہے تھے اب معاشی فائدہ شہر کو پہنچانے کی غرض سے بننے والے ملکی اور بین الا قوامی ترقیاتی منصوبوں نے پانی کی کسر بھی پوری کر دی ہے ان ترقیاتی منصوبوں کی وجہ سے نہ صرف سمندر انسان کی پہنچ سے دور ہو رہا ہے بلکہ سمندر کو شہر سے کئی گناہ دور کر دیا گیا ہے۔ جو لوگ سمندر کے کنارے کچی آبادیوں میں رہتے ہیں اور صدیوں سے ماہی گیری کے پیشے سے وابستہ ہیں ان غریبوں کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ انتظامیہ اور حکومت کی غیر منصوبہ بندی کی وجہ سے سمندر عوام سے دور ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ اسی طرح افسانہ "جس شہر میں رہنا" میں شہر کے اندرونی علاقوں میں غیر منصوباتی، بے ڈھنگی تعمیرات اور ان کی وجہ سے شہریوں کو درپیش مسائل کو بیان کیا ہے نہ صرف یہ بلکہ اس پر سارے کا سارا شہر ابلتے گٹروں اور کوڑے کے ڈھیر سے بھرا پڑا ہے۔

" آدھی سے زیادہ سڑک کو گھیر کر کرسیاں ڈال لی ہیں اور برگر، کباب رول کی دکانیں کھل گئی ہیں ایسا لگتا ہے فاسٹ فوڈ کے بازار میں بیٹھے ہیں بڑے بڑے مکان تڑوا کر گاڑیوں کے شوروم بنا لیے ہیں اور مین روڈ سے اندر گلیوں تک گاڑیاں کھڑی ہیں جن کے گاہک خدا جانے کون ہونگے اور کب آئیں گے۔۔۔"[٦]

شہر بھر میں روز بروز غیر منصوبانہ تعمیرات اور تجاوزات کا سلسلہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ان بے ڈھنگی اور غیر قانونی تعمیرات اور تجاوزات کی وجہ سے عوام کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے بعض اوقات ان کا نوٹس لیا جاتا ہے مگر اس پر عمل درآمد نہیں کروایا جاتا۔ کراچی میں انتظامیہ اور صوبائی حکومت کی مسلسل لاپرواہی کی وجہ سے شہریوں کی زندگی کو مسلسل امتحان بنا رکھا ہے۔ اسی کی دہائی کے بعد شہر میں امن وامان کی صورتحال بگڑ گئی جس پر قابو پانے میں کئی دہائیاں بیت گئیں ایسے میں صوبائی حکومت وفاقی حکومت اور شہر کی انتظامیہ ایک دوسرے پر محض تنقید اور الزام تراشیوں کے کچھ نہ کر پائے۔ لوٹ مار، اغوا اور قتل و غارت کے واقعات نے شہریوں کا جینا دو بھر کر رکھا تھا ۔ شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے والے ادارے شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے کی بجائے بے گناہ عام شہریوں کو رشوت کے ذریعے لوٹنا شروع کر دیا ہے جس شہر میں حفاظتی ادارے عوام کی فلاح و بہبود کی بجائے اپنی دولت بڑھانے میں مصروف نظر آئیں تو پھر اس شہر کا کیا حال کیا مستقبل ہو گا افسانہ "دستنبو"۔ افسانہ سمندر کی بیماری، سمندر کی چوری، شہر تہہ آب، مائی کولاچی جیسے افسانوں میں بھی شہر میں روز بروز بڑھتے مسائل ایسے میں انتظامیہ اور سیاسی شخصیات کی غفلت کو موضوع بنایا گیا ہے آصف فرخی اپنے افسانے "اسپائڈر مین" میں شہر کی

سیاسی شخصیات پر تنقیدی چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں کراچی شہر جو ملک کا سب سے بڑا شہر ہے نہ صرف یہ بلکہ ملک کو سب سے زیادہ سرمایہ فراہم کرتا ہے اس کو پوچھنے والا کوئی نہیں ہی۔ جب الیکشن کا موسم آتا ہے تو سیاسی شخصیات کراچی کی عوام کو اس قدر امید افروز خواب دکھاتے ہیں کہ عوام کو لگتا ہے کہ شاید یہی ہمارے شہر کو ڈوبنے سے بچائیں گے مگر جب عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آجاتے ہیں تو عوام سے اس طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں جیسے جانتے ہی نہ ہوں۔ لیکن اب بھی عوام اس امید کو باندھے بیٹھی ہے کہ کوئی سپائڈر مین کی طرح آئے اور ان کے سارے مسائل کو حل کر دے۔

"وہ آسمان کی حدوں میں نقاب اوڑھے بیٹھا ہے جال بنتا رہتا ہے انتظار کرتا رہتا ہے کب آنکھ جھپکے وہ اپنا وار کرے سارا شہر سانس روکے دیکھ رہا ہے خلق خدا نعرے لگا رہی ہے "اسپائڈر مین، اسپائڈر مین! وی وانٹ یو! تجھے شہر کی مکھیوں کا سلام! اے صاحب عنکبوت، تو ہی ہمارا امام ہو!"[۲]

آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں ایک لکھاری کے نظریے سے کراچی کے مسائل کو بیان نہیں کیا بلکہ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ کراچی میں رہنے والے ایک عام شہری کی دل کی آواز ہے جو اپنے شہر کے مسائل سے اس قدر پریشان ہے کہ اپنے مسائل کو کہانیوں کے ذریعے بیان کرنے کے علاوہ اسے کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔

ب: آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے ماحولیاتی مسائل کا تجزیہ

بہترین انسانی زندگی گزارنے کے لیے مناسب صحت مند ماحول بنیادی اہمیت رکھتا ہے یہی ماحول ہے جس کی وجہ سے زمینی سیارے پر زندگی کا وجود ہے آب و ہوا، چرند پرند، پیڑ پودے اور پانی مل کر انسان کو ایک مکمل زندگی گزارنے میں مدد دیتے ہیں اگر ماحول ہر طرح کی آلودگی سے پاک ہو گا تو نہ صرف انسان اس ماحول میں موجود باقی تمام مخلوقات بھی صحت مند زندگی گزاریں گے۔ پاکستان کو قدرت نے ہر طرح کی قدرتی نعمت سے نوازا ہے اس میں سال میں چار موسم آتے ہیں اس کے علاوہ اسے سمندر، پہاڑ، میدان، دریا اور صحرا جیسے بیش بہا قیمتی مناظر سے مالا مال کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اسے دنیا بھر میں انہی خصوصیات کی وجہ سے رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کراچی سمندر کی وجہ سے صدیوں سے ایک بہترین تجارتی مقام کی حیثیت رکھتا ہے یہ شہر اسی تجارتی خصوصیت کی بدولت وجود میں آیا اور ایک خوبصورت شہر کی شکل اختیار کر گیا۔ انگریزوں نے جب

سندھ پر قبضہ کیا تو انہوں نے بھی اس شہر کو اپنے تجارتی مقاصد کے لئے استعمال کیا اور اس کی تزئین و آرائش کے لیے باقاعدہ منصوبے کے تحت تعمیرات کروائیں اور اسے ایک خوبصورت قابل دید تجارتی شہر کی شکل دے دی، مگر تقسیم ہند کے نتیجے میں ہونے والی دوطرفہ ہجرت میں سب سے زیادہ ہجرت کراچی میں ہوئی۔ جس کی وجہ سے شہر کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا شہری آبادی میں مسلسل اضافے اور وسائل میں کمی کی وجہ سے نہ صرف شہریوں کو مسائل کا سامنا ہے بلکہ شہر کا ماحول بھی اس سے بری طرح متاثر ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ کراچی کا ماحول اس قدر خوفناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے کہ عام آدمی کے لیے ایک صحت مند زندگی بسر کرنا ناممکن نظر آرہا ہے۔ آصف فرخی چونکہ ایک ڈاکٹر ہیں وہ ایک ماہر سرجن کی طرح اپنے افسانوں میں کراچی کے ان امراض کی تشخیص کرتے نظر آتے ہیں جو شاید کسی اور لکھاری کے لئے اتنی اہمیت کے حامل نہ ہوں۔

آصف فرخی فطرت سے محبت کرنے والے انسان ہیں۔ آپ نے اپنے افسانوں میں جابجا سمندر اور اس کو لاحق مسائل پر روشنی ڈالی ہے افسانہ "سمندر کی بیماری" میں کراچی سمندر میں بحری جہاز کے کسی چٹان سے ٹکرانے سے آئل سپل کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔ سمندری ساحل کے قریب رہنے والے افراد ماحول میں پیدا ہونے والی گھٹن کے سبب جب گہری نیند سے ان کی آنکھ کھل جانے پر انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی کڑے ہاتھوں سے ان کا گلا دبا رہا ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو لیکر گاڑی میں سوار ہو کر باہر نکل جاتے ہیں تو انہیں بدبو کا احساس ہوتا ہے جس سے نتھنوں میں مرچیں بھر گئیں اور آنکھوں میں جلن کا احساس ہونے لگا اور اس سے بچ نکلنا مشکل ہے بدبو کے مرغولے ہوا میں پھیل رہے تھے اور ناک میں اترتے جا رہے ہیں، سڑک گاڑیوں سے بھری ہوئی ہے، سب لوگ سمندر کی طرف پیٹھ کر کے شہر کا رخ کر رہے ہیں، ہوا بوجھل تھی اور بدبو ناقابل برداشت۔ کسی کو پتا نہ تھا کہ راتوں رات کیا ہو گیا ہے سی ویو اور کلفٹن کی طرف سے آنے والی سڑکیں گاڑیوں اور لوگوں سے بھرتی جا رہی تھیں۔ اور اسی دوران کسی نے چلتی گاڑی کی کھڑکی سے منہ نکال کر کہا کہ انھوں نے سمندر کو گندہ کر دیا ہے۔

اس افسانے میں کراچی سمندر میں کسی بحری جہاز سے تیل خارج ہونے کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح اس تیل نے سمندری پانی کو زہر آلود کر دیا جس سے ہوا میں تعفن پھیل گیا اور ساحل کے قریب رہنے والے لوگ اس تعفن زدہ زہریلی ہوا سے بچنے کے لیے شہر کا رخ کر رہے ہیں۔ سمندر جو اس شہر میں رہنے والے لوگوں کے لیے تفریح کا واحد مرکز تھا جہاں آکر بہت سے لوگ سمندر کی ان لہروں سے اپنی خوشیاں

اور دکھ بانٹتے تھے۔ آج وہ بیمار ہو گیا تھا اور کسی کو بھی اس کی بیماری کی اصل وجہ معلوم نہیں تھی نہ انتظامیہ پتا لگا پا رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا اور نہ ہی عوام۔ کراچی کی عوام کے لیے قدرت کی طرف سے سمندر وہ تحفہ ہے جس پر لوگ فارغ اوقات میں چھٹی کے دن اور عید کے دنوں میں آکر محظوظ ہوتے تھے۔ سمندر کے ساحل پر ریت پر چلنا، انگلیوں سے ریت پر نام لکھنا، ریت کے گھروندے بنانا اور پھر اس میں پانی انڈیلنا ریت کی دیواروں پر سیپیاں سجانا، اونٹ کی سواری کرنا اور لہروں پر اُچھلتی گیند کے ساتھ دور تک پانی میں چلے جانا اور ڈوبتے سورج کو دیکھنا سمندر کی سیر کو آنے والے لوگوں کے لئے دلچسپی کا سامان تھے مگر سمندر میں تیل کے پھیل جانے سے اور اٹھنے والی بدبو نے سب کو سمندر سے دور بھاگنے پر مجبور کر دیا، وہی سمندر جو انکی زندگی کی علامت تھا اب انہیں موت کا فرشتہ لگ رہا تھا۔

"ایک کے بعد ایک اعلی افسر کا انٹرویو ٹی وی چینلز پر نشر ہوتا جن میں وہ مسلسل کہے جاتے کہ یہ وقتی حادثہ ہے تفریح گاہیں جلد ہی کھول دی جائیں گی۔۔۔ ایک اہم افسر نے لوگوں کی تشویش کی ساری ذمہ داری غیر ملکی نشریات پر ڈال دی: ان کا دعویٰ غلط ہے۔ لوگ بیمار ہو کر نہیں بھاگے چند مچھلیوں اور پرندوں کے سوا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ایک ہی کچھوا ہے جسے وہ بار بار دکھائے جا رہے ہیں۔۔۔ سرکاری تحقیقات جاری ہیں عوام سے اپیل کی جاتی ہے۔۔۔"[۸]

اس پر افسوس اس بات کا ہے کہ اتنا بڑا واقعہ حکومتی اعلیٰ افسران اور اہلکاروں کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کراچی سمندر میں تیل شامل ہونے کا یہ پہلا یا آخری واقعہ نہیں ہے شہر بھر کا سیوریج بغیر کسی فیلٹر کے کراچی سمندر میں شامل ہو رہا ہے اور اس پر مزید اب اس میں تیل شامل ہونے پر سمندر بری طرح متاثر ہو رہا ہے جو کہ سمندر میں رہنے والی آبی مخلوق کے لئے زہر قاتل ہے مگر اعلیٰ افسران باقی تمام معاملات کی طرح اس معاملے کی طرف سے بھی غفلت برت رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ سینکڑوں مچھلیاں، بحری پرندے، کچھوے، کیکڑے اور آبی پودے آہستہ آہستہ سمندری آلودگی کا شکار ہو کر مر رہے ہیں جس سے سمندر کا قدرتی حسن ختم ہوتا نظر آ رہا ہے اور ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے پورے کا پورا شہر ہی کسی بیماری کی زد میں آ گیا ہے۔

شہر کی صورتحال یہ ہے کہ پورے کا پورا شہر گندگی کا ڈھیر بن چکا ہے ہر گلی محلے کے کونے پر کچرا کنڈیاں بنا دی گئی ہیں جبکہ سڑکوں کو کچرے کے ڈھیر اور ابلتے گٹروں سے مزین کر دیا گیا ہے جن سے پیدا ہونے والی بدبو

ماحول کو تعفن زدہ کیے ہوئے ہے اب کسی علاقے کی شناخت کے لئے کسی مشہور عمارت یا بورڈ سے نہیں کی جاتی بلکہ سڑکوں کی حالت اور ان سڑکوں پر پھیلے کچرے سے علاقوں کی شناخت ہو جاتی ہے کہ یہ کونسا علاقہ ہے اس کچرے نے نہ صرف سڑکوں گلیوں پر قبضہ کر رکھا ہے بلکہ شہر کے بڑے بڑے نالے بھی کچرے سے بھرے پڑے ہیں اور کچھ ان نالوں پر بنے کچی آبادی کے گھروں اور دکانوں نے کسر پوری کر دی ہے جس سے نالوں نے اپنا کام کرنا تقریباً چھوڑ دیا ہے نالوں کا کام شہر میں جمع ہونے والے اضافی پانی کو سمندر تک پہنچانا تھا مگر نالوں سے سمندر تک فلٹر ہوئے بغیر گندا پانی جس میں کوڑا کرکٹ بھی شامل ہوتا ہے سمندر میں شامل ہو رہا ہے جس سے سمندر میں موجود آبی مخلوق اور پودے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔" میں نے جان لیا کہ میں مر گیا۔ میرا شہر مر گیا۔ میرے شہر کا سمندر مر گیا۔ اس کے ساحل مر گئے۔ سینکڑوں مچھلیاں، کچھوے، بحری پرندے کیکڑے، آبی پودے۔۔۔"[۹]

"سمندر کی چوری" کا شمار ان افسانوں میں کیا جاتا ہے جو اپنی مثال آپ ہیں یہ افسانہ نہیں بلکہ کراچی شہر کی موجودہ حالت اور آنے والے مستقبل کی اصل تصویر ہے۔ اس افسانے کے ذریعہ ہمیں خبردار کیا جارہا ہے کہ اس شہر کا مستقبل کچھ بھی ہو سکتا ہے اگر ہم نے اپنے موجودہ حالات کو بہتر کرنے کی کوشش نہ کی تو اس شہر کا مستقبل کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ کہانی ہم سب کو سوچنے پر مجبور کر رہی ہے اس افسانے کے بارے میں پروفیسر مسکین احمد منصور کہتے ہیں کہ

> "سمندر کی چوری" مستقبل کا افسانہ ہے یہ امکانات کی کہانی ہے ایسے امکانات جو آج ناممکن نظر آتے ہیں اور کل ممکن ہو جاتے ہیں یہ افسانہ بارش کے پہلے توانا، بہادر اور نڈر قطرے کی طرح ہے جس کے پیچھے آنے والے قطروں کی قطار لگ جاتی ہے۔"[۱۰]

افسانہ "سمندر کی چوری" میں افسانہ نگار نے اپنے اندیشوں کو ظاہر کیا ہے جو کراچی کے ماحول کے لئے زہر قاتل بن رہے ہیں بدعنوانی، بدانتظامی اور بے ڈھنگی منصوبہ بندی باور کرا دیتے ہیں کہ یہاں کے شہری ایسے ماحول میں خوب پنپتے منافع خوروں کے رحم و کرم پر ہیں۔ کراچی کے ساحل کے ساتھ حالیہ تبدیلیاں ظاہر کرتی ہیں کہ چار قسم کے گروپ یعنی علاقائی نباتات اور حیوانات مچھیرے، عام شہری اور اراضی کے مالکان ناجائز اور بے ہنگم ترقیاتی کاموں سے بری طرح متاثر ہو سکتے ہیں۔

"یہ ماحول کا قتل ہے یہاں مینگروو کے نیچرل ذخیرے ختم ہو جائیں گے۔۔۔ ساری وائلڈ لائف۔۔۔ بہت نازک سا ماحولیاتی توازن ہے ان کی اور انسانوں کے درمیان۔ ایک تباہ ہو گا تو دوسرا برقرار نہیں رہ سکے گا۔۔۔"[۱۱]

سمندر ساحل پر ہونے والے ترقیاتی کام جو بظاہر تو امیر طبقے کو مزید فائدہ دیں گے مراعات یافتہ طبقے کراچی کے اس بد نما خوشنمائی سے عالمی معیار کا شہر ہونے پر جشن تو منا سکتے ہیں مگر ان تبدیلیوں کے نتیجے میں آنے والی تباہی ان میں اور عوام میں کوئی فرق نہیں کرے گی۔ اگر کراچی کے گندے نالوں اور برساتی پانی کی نکاسی کے سسٹم پر تجاوزات بنتی رہیں تو امیر و غریب دونوں طبقے سخت نقصان اٹھائیں گے۔ اگر کلفٹن کے ساحل پر سیر کرنے آنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس سمندر میں کس قدر فیکٹریوں کا گندا تیزاب شدہ اور شہری نالوں سے فلٹر ہوئے بغیر گندہ پانی روزانہ کتنی مقدار میں سمندر میں شامل ہوتا ہے تو یہاں آنے سے پہلے کئی مرتبہ سوچیں یہ تمام عوامل مل کر ہمارے ماحول کو دن بدن مزید گندا اور ناقابل برداشت بنا رہے ہیں۔

"ان میں سے ایک آدمی کو لگا جیسے سمندر پھر دکھائی دے رہا ہے۔۔۔ پانی گدلہ ہے اور ریت پر کوڑا بکھرا ہوا ہے جوس کے خالی ڈبے، پلاسٹک کی تھیلیاں، موسمی کے چھلکے، پیکٹ جو استعمال کے بعد چرمرا کر پھینک دیے گئے ہیں اور پیچھے ہٹتی ہوئی لہروں کے سامنے بے تحاشا لوگ اتنی سی جگہ میں بھرے ہوئے اور پھر بھی تفریح کے موڈ میں ۔۔۔ پھر ان کے سامنے دیوار، عمارت کا ادھ بنا ڈھانچہ جس نے سمندر کو دونوں ہاتھوں سے جیسے بھینچ لیا ہو گدلے پانی کے اوپر تیل کے کالے چکتے جو پانی کے بہاؤ کے ساتھ پیچھے ہٹنے کے بجائے وہیں جم کر کھڑے ہیں مری ہوئی مچھلیوں کی سڑی بدبو جو دھیرے دھیرے بڑھتی جا رہی ہے یہاں تک کہ اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ سانس رکنے لگتا ہے سانس میں جیسے کوئی چیز پھنس رہی ہے اور قے کو روکتے ہوئے اب وہاں سے مڑ کر واپس جانے لگتے ہیں سمندر سے مخالف سمت میں۔۔۔"[۱۲]

جب شہر بھر میں صفائی کا نظام اس قدر افسوس ناک صورت اختیار کر چکا ہوں ایسے میں اس شہر کا ماحول نہ صرف انسانوں بلکہ اس شہر میں رہنے والے حیوان و نباتات اور پودوں کے لیے جان لیوا ہے۔ آصف فرخی کراچی کے نوحہ گر ہیں آپ نے اپنے افسانوں میں کراچی کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی حالت زار پر

ماتم کیا ہے۔ اسی طرح آپ نے اپنے افسانے مائی کولاچی آج کا مرنا وغیرہ میں بھی ان مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

ج۔ آصف فرخی کے افسانوں میں امن وامان کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ

کراچی جسے دنیا کے بڑے شہر وں میں شمار کیا جاتا ہے جسکی رونق اور زندگی سے بھرپور ہلچل کو دیکھتے ہوئے اسے روشنوں کا شہر کہا گیا لیکن پچھلے کچھ سالوں سے خوف اور دہشت کی تصویر بنا ہوا ہے۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں کراچی کی صورتحال کو خصوصی اہمیت دی اور کراچی کو درپیش امن امان کی صورتحال کو بڑی باریک بینی اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کراچی آج جن مسائل کا شکار ہے ہمیشہ سے ایسا نہ تھا دنیا بھر سے سیاح یہاں سیر و تفریح کی غرض سے آتے کراچی کی رنگارنگ ثقافت، لذیذ کھانوں اور رونق سے بھرپور گلیوں بازاروں اور یہاں کے مقامی لوگوں سے ملنے والا پیار، خلوص، مہمان نوازی کی خوبصورت یادوں کو اپنے ساتھ سمیٹ کر اپنے دیس واپس جاتے تھے نہ صرف یہ بلکہ ملک بھر کے مختلف شہروں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے اس شہر میں روزگار کی تلاش میں آتے تھے پھر اچانک کچھ ایسا ہوا کہ اس ہنستے بستے شہر کو کسی کی نظر لگ گئی صبا اکرام اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> "۱۹۸۸ء میں حیدرآباد (سندھ) میں منعقدہ ریلی میں شرکت کے بعد واپس آتے ہوئے کراچی میں سہراب گوٹھ کے مقام پر مہاجر قومی موومنٹ (حالیہ متحدہ قومی موومنٹ) کے قافلے پر نامعلوم لوگوں کی فائرنگ سے چند مہاجر نوجوانوں کی موت کے نتیجے میں شہر میں جو ہنگامہ کھڑا ہوا اس نے کراچی میں امن و امان کی صورت کو مسلسل کئی برسوں تک متاثر کیے رکھا۔"[۱۳]

کراچی کی امن وامان کی صورتحال کو موضوع بناتے ہوئے آصف فرخی نے دو افسانوی مجموعے "شہر بیتی" اور "شہر ماجرا" تحریر کیے ان دونوں افسانوی مجموعوں میں آصف فرخی نے کراچی میں آئے دن ہونے والے دہشت گردی کے واقعات اور انکی وجہ سے شہر میں امن وامان کی بگڑتی صورتحال اور اس کے شہریوں کی زندگی پر پڑنے والے اثرات کو تفصیل اور باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ ان مجموعوں کا مطالعہ کرنے

کے بعد ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کراچی کو پچھ کچھ سالوں میں کس قدر درد اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس نے اپنے اندر کس قدر دکھ اور تکالیف سمیٹ رکھی ہیں۔

آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں کراچی میں رہنے والے فرد کے شب و روز کے ان حالات و واقعات کو کراچی کے امن وامان کے مسائل کے تناظر میں بیان کیا ہے جن سے متاثر ہو کر فرد کے معمولات زندگی متاثر ہو رہے ہیں۔ اپنے ایک افسانے "فریکچر"(شہر بیتی) میں آصف فرخی ایک ایسے فرد کے شب و روز پر روشنی ڈال رہے ہیں جو شہر میں آئے روز ہونے والے ہنگامی حالات کی وجہ سے یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ آیا اسے دفتر جانا چاہیے کہ نہیں۔ اگر وہ دفتر کے لیے گھر سے نکل پڑتا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ شہر میں حالات کی خرابی کی وجہ سے راستے بند ہو جائیں اور اسے پریشانی کا سامنا کرنا پڑے مزید یہ کہ اخبار سے بھی شہریوں کو شہر کے صحیح حالات کا اندازہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس میں بھی روزانہ ایک جیسی خبریں چھپتی ہیں جن سے شہر کے حقیقی حالات کا کچھ پتا نہیں چلایا جا سکتا۔ ان حالات میں شہریوں کا گھر سے باہر نکلنا کسی خطرے سے کم نہیں ایسے میں ٹیلی فون کے ذریعہ ہیں دوست احباب اور رشتہ داروں کی خیریت دریافت کی جاتی ہے اور ایک دوسرے سے اپنے اپنے علاقے کی خیر خبر لی جاتی ہے۔

> "وہ توسب پرسوں شام ہی سے بڑے بھیا کے ہاں ہیں"۔ میں تفصیل سے بتانے لگا۔ "جلوس کا راستہ جب روکا گیا اس کے بعد سے وہاں فائرنگ ہونے لگی۔ قریب ہی کوئی عورت فلیٹ کی بالکنی میں کھڑی ہوئی تھی، اس کے گولی لگی اور وہ مر گئی۔ پھر یہ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہوا تو سعید کی طرف سے فکر ہونے لگی۔ وہ بھی تو ادھر ادھر جا کر باتیں کرنے سے باز نہیں آتا۔ بس اسی وجہ سے گھر بند کر کے بڑے بھیا کی طرف چلے گئے۔"[۱۴]

شہر میں امن وامان کی صورتحال اس قدر نازک ہے کہ مائیں اپنے جوان بچوں کو چھپائے چھپائے پھر رہی ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ایسے ہی کسی انجان گولی کا شکار ہو جائیں۔ کسی بیمار کی عیادت کے لیے بھی گھر سے نکلنا محال ہے کوئی پتا نہیں کہ اگلے ہی لمحے شہر کے حالات کون سا رخ اختیار کر لیں۔ آصف فرخی نے ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے فرد کی آنکھ سے کراچی کو دیکھا اور اس کی لہو بہاتی آنکھوں کے پیچھے چھپے درد کو محسوس کیا ہے۔ وہ اپنے ایک افسانے "شہر بین"(شہر بیتی) میں جو کہ اپنے عنوان سے ہی ظاہر ہے اس میں شہر بین جو کہ ایک اخبار میں بطور صحافی کام کرتا ہے کس طرح ایک اخباری دفتر میں بیٹھ کر اخبار کے لیے خبریں تیار کرتا

ہے۔ یہ خبریں معمولی رد بدل کے ساتھ روزایک جیسی ہوتی ہیں مثلاً آج اتنے قتل، محاصرہ، قومی رہنماوں کے سیاسی بیانات میں سے بہت سے بیانات بس ایک رسمی تحریر کی طرح دوبارہ لکھ دیئے جاتے ہیں جن سے کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندہ انسانوں کی بے وجہ موت اور قتل کی خبریں نہیں بلکہ افسانے ہیں۔

"کراچی (اسٹاف رپورٹر) مختلف علاقوں میں مسلح افراد کی فائرنگ سے ایک عورت سمیت سات افراد ہلاک اور دس زخمی ہوگئے۔ تفصیلات کے مطابق ملیمیں سیکٹر ۱۵ میں موٹر مکینک کی دوکان پر پیلی ٹیکسی میں آنے والے افراد کی اندھا دھند فائرنگ سے ۲۵ سالہ عابد، ٦۵ سالہ محمد نبی ہلاک اور محمد حمید، اختر اور سید محمد رضا زخمی ہوگئے جو فائرنگ کے وقت مکینک کی ورک شاپ پر گاڑیوں کی مرمت کے سلسلے میں موجود تھے۔"[۱۵]

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شہر کے حالات اس قدر گھمبیر ہیں کہ کوئی بھی شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت ،بچہ ہو یا بوڑھا کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس شہر کراچی میں زندگی گزارنے والے افراد کی زندگیاں ان پر اس قدر تنگ کر دی گئی ہیں گی کہ نہ وہ خود کو گھر پر محفوظ سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی باہر ہر وقت وقت موت کا سایہ سر پر تلوار کی طرح محسوس ہوتا ہے اسی طرح "اس میں ظالم بوئے خون کی راہ ہے" (شہر بیتی) میں بھی فرد کی اپنے شہر کے حالات کے سامنے بے بسی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار کا تعلق چونکہ کراچی سے ہے اسی لیے انہوں نے ان حالات کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے اور نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ خود بھی ان حالات کا شکار رہے ہیں۔ انہوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کو اس اذیت ناک اور عدم یقینی بھرے حالات سے لڑتے اور خود کو ان کے سامنے بے بس اور مجبور ہوتے پایا ہے۔ "شہر بیتی" میں شامل ایک افسانہ "ایک فیصلہ کن دن" میں ایک ایسے ہی گھرانے کی سوچ اور خیالات کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ یہ خیالات ایک گھرانے کے نہیں بلکہ کراچی شہر میں بسنے والے ہر فرد اور گھرانے کی ترجمانی کرتے ہیں گھر میں شام کی چائے کے ساتھ اخبار میں چھپنے والی ایک خبر پر تبادلہ خیال کیا جارہا ہے۔ اخبار میں یہ خبر چھپی ہے کہ کراچی کیلئے اگلے چوبیس گھنٹے بہت نازک ہیں اور یہ توقع کی جارہی ہے کہ کراچی کے حالات سے پیدا ہونے والے بحران کے بارے میں اہم فیصلے کیے جائیں گے یہ خبر پڑھنے کے بعد تمام گھر والے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور یہ خبر یہ امید بھی بندھاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اب حالات بہتر ہو جائیں۔

"اب فیصلہ ہو بھی چکے۔ کسی طرح یہ سلسلہ بند بھی تو ہو کہ روز دس بارہ، دس بارہ آدمی مارے جا رہے ہیں۔ آج ایک محلے میں گڑبڑ ہو گئی تو کل دوسرے میں۔ اور وہی فائرنگ جس کے مجرم پکڑے نہیں جاتے۔"[۱۶]

قتل و غارت کے اس کھیل سے تنگ آکر ماں باپ نے اپنے جوان بچوں کو گھروں میں قید کر رکھا ہے کہ کہیں ایسی ہی اچانک فائرنگ کے نتیجے میں وہ اپنی زندگی کا کل سرمایہ، اپنے جگر کے ٹکڑوں کو نہ کھو بیٹھیں۔ "ابھی اطلاع ملی ہے کہ ایدھی سنٹر والوں نے لاوارث لاشوں کے ساتھ اٹھا لیا۔ کس وقت گولی لگی ہے، یہ نہیں معلوم۔ اب لاش لینے جا رہے ہیں۔"[۱۷]

موت گویا کراچی کی سڑکوں پر رقص کر رہی ہے آپ اور آپ کے پیارے کب اور کہاں مارے جائیں کچھ معلوم نہیں۔ نہ مارنے والے کو پتا ہے کہ وہ کیوں مار رہا ہے اور نہ مرنے والے کو خبر ہے کے آخر اس کا جرم کیا ہے؟ ٹی وی اور اخبارات پر نشر ہونے والی خبروں کو سن کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ افسانہ "ناگن چورنگی" (شہر بیتی) میں کراچی میں رہنے والوں پر خوف وہراس اور دہشت پھیلانے کے لیے شہر کی نامور شخصیات کو قتل کیا جا رہا ہے اور باقاعدہ ایسے لوگوں کی لسٹیں تیار کی گئی ہیں جنہیں آنے والے دنوں میں قتل کیا جائے گا۔ تاکہ شہر میں رہنے والا ہر فرد خود کو غیر محفوظ اور بے بس تصور کرے۔ افسانہ "بوچھار" میں افسانہ نگار نے کراچی میں ہونے والی مسلسل فائرنگ کی کاروائی کو بارش سے تشبیہ دی کہ جس طرح تیز بارش میں کسی شخص کا گھر سے باہر قدم رکھنا دوبر ہوتا ہے اسی طرح کراچی میں فائرنگ کی بارش ہوتی ہے۔ "کراچی میں بارش اس کی آواز میں حیرت کی گونج ٹیلی فون پر بھی محسوس ہوئی میں تو اس لیے رکا ہوا تھا کہ یہاں رات سے فائرنگ ہوتی رہی ہے۔"[۱۸]

مذکورہ بالا افسانہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ شہر کی حالت اس وقت اس قدر تشویشناک ہے کہ شہر میں گولیوں کی بوچھار ہو رہی ہے۔ بارش کی نہیں گولیوں کی یہ بوچھار انسانی زندگیوں کو بھسم کر رہی ہے ایسی صورت حال میں کسی بھی نئی امید کا خیال آنا بھی محال ہے۔ آصف فرخی اپنے افسانوی مجموعے "اسم اعظم کی تلاش" میں شامل ایک افسانے "شہر ناپرساں" میں شہر کی امن وامان کی صورتحال بگڑنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ایک نئے منظر نامے کو قاری کے سامنے کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ شہر میں اس قدر خوف اور دہشت کا راج ہے کہ ایک فرد دوسرے فرد کو تحفظ فراہم کرنے سے بھی ڈر رہا ہے حتیٰ کہ فرد اپنے سائے سے بھی خوف محسوس کرنے لگے ہیں۔ خوف کا یہ عالم ہے کہ شہری کو اجنبی لوگ اپنے گھر میں گھومتے پھرتے نظر آرہے

ہیں۔ یہ شہر ناپرساں ہی تو ہے جہاں خون میں نہائی ہوئی لاش بے یارومددگار پڑی ہے مگر لوگ اسے ہاتھ لگانے سے بھی ڈر رہے ہیں۔ اس حوالے سے عرفان جاوید لکھتے ہیں کہ

"شہر برلب آب کا تذکرہ مسلسل اُسے اُسی شہر ناپرسان تک محدود کر دینے کا باعث لگنے لگتا ہے اور جب یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تحریروں کے کینوس پر جو مرضی رنگ اتاروان پر ایک ہی شہر ابھرے گا تو یکایک ان افسانوں کا یہ پہلو اپنے آپ کو اس طرح منکشف کرتا ہے کہ اس بستی کے ساکن نے پورے دیس کو اس شہر کی عینک ہی سے تو دیکھا ہے اور یہ مشاہداتی پہلو عین قرین فطرت ہے۔"[۱۹]

کراچی شہر میں دن بدن بگڑتی امن وامان کی صورتحال نے فرد کی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے یہاں تک کہ شہر میں شادی بیاہ کی تقریبات کو ایسے چھپ چھپا کر خاموشی سے کرنے کو ترجیح دینے لگے جیسے کوئی غلط کام کرنے جارہے ہوں افسانہ "ایک شادی شہر میں" اسی صورت حال کو موضوع بنایا گیا ہے کہ بیٹی والے اپنی بیٹی کی شادی کی تقریب کو لے کر کس قدر پریشان ہیں شہر میں ہر وقت کی ہنگاموں کو دیکھتے ہوئے شادی ہال اور دلہن کی گاڑی کے ساتھ بھی دو گن مین حفاظت کیلئے رکھے جائیں گے۔ یعنی قتل وغارت اور دہشت گردی کے واقعات نے پورے ماحول کو اس قدر اپنے قابو میں لے رکھا ہے کہ لوگ اپنی خوشیوں کو بھی پوری طرح خوشی اور اطمینان منانے سے ڈر رہے ہیں نہ صرف یہ بلکہ دوسرے شہر سے تعلق رکھنے والے کراچی کا نام سنتے ہی عجیب دہشت اور خوف محسوس کرنے لگے ہیں وہی کراچی جہاں پہلے لوگ اس کی رونق بھری زندگی سے لطف اندوز ہونے آتے تھے۔ اب اس شہر میں موجود ہونے کے باوجود کہیں باہر نکلنے اور حتیٰ کہ اس شہر میں موجود دوستوں سے بھی ملنے سے کتراتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کراچی میں ہونے کے باوجود کراچی میں رہنے والے دوستوں سے صرف اس لئے ملاقات کرنے سے کتراتے ہیں کہ کہیں اس ملاقات کے چکر میں کسی انجان گولی کا شکار نہ ہو جائیں ٹیلی فون پر بات کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں (ملاقات) اس کے علاوہ افسانہ "جس شہر میں رہنا "میں بھی شہر میں امن وامان کی بگڑی ہوئی صورت حال اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

افسانوی مجموعہ "شہر ماجرا" کے آغاز میں آصف فرخی نے "ادونس" کی طویل نظم "صحرا بیروت کے محاصرے کی ڈائری" سے ایک اقتباس نقل کیا ہے اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد ہم اس مجموعے میں پائی جانے والے افسانوں میں خوف اور دہشت کی شدت اور کرب کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوی

مجموعے "شہر بیتی" میں کراچی شہر میں ہونے والی ہنگامی صورتحال کا آغاز بیان کیا ہے جبکہ "شہر ماجرہ" میں موجود افسانوں میں کراچی میں پھیلی شدید دہشت کی فضا اور قتل وغارت کے گرم بازار کی اصل تصویر کو بیان کیا گیا ہے۔اس مجموعے میں شامل پہلا افسانہ "ڈرائے گئے شہر کے باطن" میں بتایا گیا ہے کہ کس فرد کی مجبوریاں اسکی داخلی وخارجی کشاکش کی آئینہ دار ہیں فرد اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود اپنے حالات اور اپنے ارد گرد پھیلے خوف وہر اس میں گرے ماحول کے سامنے بے بس اور مجبور ہے۔حالات اس قدر سنگین صورت اختیار کر چکے ہیں کہ اخبار کی سرخیوں میں کھلم کھلا اعلان ہو رہا ہے کہ قوم کے دو اڑھائی لاکھ افراد کے قتل کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے اور اس ساری صورتحال کے سامنے ساری قوم بے بس اور مجبور تماشائی ہے اور ایسے میں وہ سرخ رنگ سے دیواروں پر یہ لکھ رہی ہے کہ انہیں منزل نہیں رہ نما چاہیے۔

> "انہوں نے ایک بیان میں الزام لگایا کہ آخری راؤنڈ کی تیاری مکمل کر لی گئی ہے۔ گلیوں سڑکوں پر فائرنگ کے بعد لوگوں کو ان کے گھروں میں گھس گھس کر مارا جائے گا۔میری قوم کے دوڈھائی لاکھ افراد کو قتلِ عام میں ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔"[۲۰]

ان افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ منزل کی حصولیابی کے لیے ہمیں مزاحم اور ارذل قوتوں کا سامنا ہے اب اپنے ہی ہم وطنوں اور ہم جنسوں کی سازشوں اور نفرت کے پھیلتے کڑوے کسیلے دھوئیں سے ہانپ ہانپ کر فرد کے اعصاب جواب دے چکے ہیں۔ان نامسائد حالات نے اسے اس قدر مجبور اور لاچار کر رکھا ہے کہ اسے فرار کی کوئی راہ نہیں ملتی موت ہر وقت اسے اپنے گرد منڈلاتی نظر آتی ہے۔یہاں تک کہ مذہبی تہوار کے دن عید کی نماز کیلئے مسجد جانے سے بھی فرد خوف محسوس کرنے لگا ہے کیونکہ مسجدیں بھی اب شہر بھر میں پھیلی دہشت گردی اور فائرنگ کے واقعات سے محفوظ نہیں ہیں۔وہ بھی جنگ کے میدان میں بدل چکی ہیں۔آصف فرخی نے اپنے افسانے "شہ گام" اور "صلوۃ الخوف" میں اسی نقطے پر روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح مساجد کو دہشتگردی کا نشانہ بنایا جارہا ہے اور اس دہشتگردی میں استعمال ہونے والی گاڑیاں بھی عام شہریوں کی ہیں اور اس کے نتیجے میں مارے جانے والے بھی عام معصوم شہری ہیں۔ فائرنگ، دہشت گردی اور ہر وقت موت کے خوف تلے زندگی گزارنا کراچی میں رہنے والے فرد کے لیے زندگی کا معمول بن گیا ہے۔افسانہ "گھر گھر پھیلا سوگ" میں اسی نقطے پر روشنی ڈالتے ہوئے آصف فرخی کہتے ہیں کہ روزانہ مختلف علاقوں میں ہونے والی فائرنگ اور درجنوں افراد کی ہلاکت جیسے واقعات روزمرہ ہونے

والے واقعہ اور معمول زندگی بن گئے ہیں۔ تھوڑی بہت فائرنگ تو اب ان کے لیے کوئی بڑی بات ہی نہیں رہی ہے ایسے میں لوگ اپنے کاموں میں ایسے ہی مگن رہتے ہیں جیسے یہ تھوڑی بہت ہونے والی فائرنگ کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن اس بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کب کون کس وقت اس اچانک ہونے والی فائرنگ کا شکار ہو کر اپنی جان گنوا بیٹھے۔

افسانہ "اجمیر نگری" میں آصف فرخی ایک نئے زاویے سے کراچی میں ہونے والے قتل وغارت کے اس کھیل کو بیان کرتے ہیں کہ کس طرح شہر میں ہونے والے قتل وغارت کے اس کھیل میں نہ جانے کتنی مائیں اپنے جگر گوشوں کو کھو بیٹھی ہیں۔ آصف فرخی نے اس افسانے میں ایک ماں کی دکھ بھری کہانی کو بیان کیا ہے کہ کس طرح ایک ماں غربت اور مفلسی سے لڑ کر اپنے بچوں کو پال کر جوان کرتی اور جب وہ بچہ جوان ہو کر اس کا سہارا بنتا ہے تو ایک دن اچانک کسی گولی کی زد میں آ کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے اور وہ ماں جو اپنے بچوں کے سہارے زندگی گزار رہی تھی۔ اس طرح اچانک اس کی کوکھ اجڑ جاتی ہے۔ ان اُجڑی ماؤں کے دکھ کو آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے جو کراچی کے ہنگامہ خیز حالات میں اپنے جوان بچوں کو کھو بیٹھی ہیں جنہوں نے اتنی محنت اور محبت سے پال پوس کر اپنے بچوں کو جوان کیا تھا کہ ایک دن انکی ساری محنت کا صلہ تمام قربانیوں کے بدلے ایک مضبوط جوان بیٹا ان کے بڑھاپے کا سہارا ہو گا مگر وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ کوئی ایک لمحے میں ان کی ساری زندگی کی محنت اور قربانیوں کو غارت کر گیا اور اس ماں کی کوکھ ایک بار پھر خالی ہو گئی۔" اماں گلی کی وہ لاش بھیا کی ہے۔۔۔ میں نے اسے۔۔۔ میں نے انہیں سیدھا کر کے دیکھا ہے۔"[۲۱] اسی طرح "شہر ماجرا" میں شامل ایک اور افسانے "آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے" میں بوڑھے نابینا ماں باپ کی زندگی کا واحد سہارا ان کا بیٹا جب ان کی پیاس بجھانے کے لئے پانی لینے کے لئے جاتا ہے تو اپنے ہی ملک کے حاکم راجہ کے ہاتھوں مارا جاتا ہے اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ ملک کے حاکم، سیاستدان جو رعایا کو تحفظ دینے کا دعوی کرتے ہیں اصل میں اپنی رعایا کو کسی جنگل کے جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور جب چاہے جس کی چاہے جان لے لیتے ہیں یعنی اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ کہ جیسے جنگل میں رہنے والے جانور کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہیں جب چاہے اسکا شکار کیا جا سکتا ہے اسی طرح اس شہر میں رہنے والے افراد کی زندگیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے کوئی جب چاہے انہیں شکار کر سکتا ہے نہ کوئی پوچھنے والا ہے اور نہ ہی روکنے والا۔ اس شہر میں جنگل کا قانون نافذ ہے طاقتور کمزور کو جینے کا حق بھی نہیں دیتا۔ اس صورت حال کو آصف فرخی نے انتہائی طنزیہ انداز میں ایک ٹی وی ڈرامے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ افسانوی مجموعے "شہر ماجرا" میں شامل افسانے "محاصرہ

"میں شہر کراچی کی ہنگامہ خیز صورتحال اور اس کے نتیجے میں عام شہری زندگیاں کس طرح متاثر ہو رہی ہیں ان میں سے ایک نقطے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک ماں کس طرح راتوں کو جاگ کر بڑی محبت اور پیار سے اپنے بچوں کو پال پوس کر جوان کرتی ہے جب وہ بچے جوان ہو جاتے ہیں تو بعض اوقات انہیں اپنی روزی کی تلاش اور بہتر مستقبل کیلئے ماں اپنے جگر سے الگ کرنے پر بھی راضی ہو جاتی ہے ایسی ہی ایک ماں کی کہانی کو "محاصرے" میں بیان کیا گیا ہے کہ ماں اپنے بیٹوں کے بہتر مستقبل کیلئے اپنے دل پر پتھر رکھ کر ان سے لگ تو رہ رہی تھی لیکن یہ تھا کہ اس کے بچے اس سے ملنے کے لیے وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہتے تھے مگر جب سے شہر میں قتل و غارت کا سلسلہ دن بدن زور پکڑ تا جارہا ہے تب سے ماں اپنے بیٹوں کی صورت دیکھنے کو بھی ترس گئی ہے ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود اس کے بیٹے اس کے لیے پردیسی بن گئے ہیں اور ماں یہ دکھ جھیلنے پر صرف اس لیے راضی ہو گئی ہے کہ اس کے بیٹے خیریت سے رہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قسم کی لاپرواہی اسے اس کے بیٹوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دے۔

آصف فرخی کا شمار ان جدید لکھاریوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد کے آشوب کو موضوع بنایا، جدید دور کے انسان کے سماجی اور ذہنی رویوں ان کے پیچھے چھپی نفسیات اور معاملات سے آگہی حاصل کی۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں اقدار کی پامال اور زندگی کی بے توقیری کے نوحے بھی لکھے نہ صرف یہ بلکہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی ماحول کو تاریخی و تہذیبی تسلسل کے رنگ میں دیکھا۔ فرد کے اندر موجود نفسیاتی کشمکش اور اس کے ظاہر و باطن میں موجود خلا کو محسوس کیا۔ اپنے سماج میں پھیلی بے حسی کو نمایاں کیا اور کراچی کی سہمی ہوئی فضا، ہر وقت کے انجان اندیشوں، بے یقینی کی صورتحال اور مزید یہ کہ ہلاکت آفریں ماحول کی سچی تصویر قاری کے سامنے رکھ دی۔ آصف فرخی نے اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات کو دیکھتے ہوئے ان سے حاصل ہونے والے تجربات و مشاہدات کو اکٹھا کرنے کے بعد کراچی میں موجود زندگی کے تمام منظر ناموں کو افسانوں میں یکجا کر دیا ہے۔

المختصر کوئی بھی معاشرہ شہر یا ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس میں رہنے والے افراد خود کو ہر لحاظ سے محفوظ نہ سمجھیں۔ رعایا کا خود کو اعلیٰ قیادت کے ہوتے ہوئے بھی غیر محفوظ سمجھنا اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ معاشرہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے اور وہاں جنگل کا قانون رائج ہے جو جتنا طاقتور ہو گا وہ اتنا ہی محفوظ ہو گا اور طاقتور کمزور پر اپنی زور آزمائی کا پورا حق رکھتا ہے۔ کمزور آزاد ہوتے ہوئے بھی قید ہے وہ اپنی اپنی عزت، جان اور مال کو کسی طور پر بھی محفوظ نہیں سمجھ سکتا کیونکہ کوئی بھی کسی بھی وقت اس سے یہ سب چھین

سکتا ہے اور کمزور چپ چاپ اپنا سب کچھ دینے پر مجبور ہے ۔اس پر مزید یہ کہ کراچی جسے پاکستان کا میٹروپولیٹن شہر کہا جاتا ہے۔ جہاں لوگ یہ سوچ کر آتے ہیں کہ وہاں انہیں وہ سہولیات ملیں گی جو انہیں چھوٹے شہروں، علاقوں اور قصبوں میں میسر نہیں ہیں مگر جب کراچی جیسے بڑے شہر کے سیاسی وانتظامی امور کارازان پر عیاں ہوتا ہے توان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں کراچی کو درپیش سیاسی و انتظامی مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے کراچی کے مسائل کو بیان کیا ہے اور سیاستدانوں اور انتظامیہ پر طنزیہ چوٹ کرتے ہوئے ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے جو اب کراچی کی عوام کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ اسی طرح اگر آصف فرخی کے افسانوں کا تجزیہ کیا جائے توانہوں نے اپنے افسانوں میں کراچی کے ماحول کو لے کر سنجیدہ اور فکر مندانہ رویے کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر کی طرح مرض کی تشخیص کرتے اور اس کے نتائج کے حوالے سے خبر دار کرتے ہیں کہ اگر شہر کے ماحول کو بہتر بنانے کے حوالے سے کوشش نہ کی گئی تو اس کے سنگین نتائج دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔ اس لیے وہ ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح مریض کو مرض بڑھنے سے پہلے ہی احتیاط کرنے کو کہتے ہیں۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں نہ صرف شہر کی موجودہ صورتحال کو موضوع بنایا ہے بلکہ موجودہ صورتحال کو دیکھتے ہوئے مستقبل کی پیش گوئی بھی کی ہے۔ اس طرح آپ کے افسانے اپنے اندر جدت اور نیا پن لیے ہوئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ آصف فرخی، میرے دن گزر رہے ہیں، شہر زاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص:۱۶۴

۲۔ ایضاً، ص:۱۴۷

۳۔ مظہر عباس، لاوارث، روزنامہ جنگ، کراچی، ۲ ستمبر ۲۰۲۰

۴۔ آصف فرخی، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا، فضلی سنز پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص:۳۱

۵۔ ایضاً، ص۴۵

۶۔ آصف فرخی، شہر بیتی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص:۱۴۷

۷۔ آصف فرخی، میرے دن گزر رہے ہیں، شہر زاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص:۴۰

۸۔ ایضاً، ص۴۷

۹۔ آصف فرخی، میرے دن گزر رہے ہیں، شہر زاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص:۴۷

۱۰۔ مسکین احمد منصور، پروفیسر، آصف فرخی کے دو افسانے، مشمولہ: شعر و حکمت، جلد اول، حیدر آباد، جولائی ۲۰۱۰ء، ص:۱۳۶

۱۱۔ آصف فرخی، میرے دن گزر رہے ہیں، شہر زاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص۲۰۴

۱۲۔ ایضاً، ص۲۱۴

۱۳۔ صبا اکرام، ڈاکٹر، جدید افسانہ-چند صورتیں، زین پبلشرز، نارتھ ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۲۰۰۱ء، ص۳۶

۱۴۔ آصف فرخی، شہر بیتی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص:۱۹۔

۱۵۔ ایضاً، ص:۴۷۔

۱۶۔ ایضا، ص:۶۷-۶۸۔

۱۷۔ ایضا، ص:۶۹

۱۸۔ ایضا، ص:۸۱

۱۹۔ عرفان جاوید، انتخاب اور مقدمہ، سمندر کی چوری، آصف فرخی کے منتخب افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص:۱۶

۲۰۔ آصف فرخی، شہر ماجرا، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص:۱۴

۲۱۔ آصف فرخی، شہر بیتی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص:۶۸

باب چہارم:

مجموعی جائزہ، نتائج، سفارشات

مجموعی جائزہ

زیر نظر تحقیقی مقالے میں آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کے مسائل کی پیشکش کا سماجی مطالعہ کیا گیا ہے۔ کراچی پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کا شمار پاکستان کے میٹروپولیٹن شہروں میں بھی کیا جاتا ہے۔ میٹروپولیٹن شہر ہونے کے ناطے یہ نہ صرف اپنے اردگرد موجود چھوٹے شہروں، قصبوں اور علاقوں کے لیے روزگار کا ذریعہ ہے بلکہ پورے ملک کا معاشی گڑھ تصور کیا جاتا ہے۔ انسان ایک سماجی جانور ہے وہ اکیلا زندگی بسر نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ فرد ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک سماج یا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں یہ سماج انہیں بھرپور اور مکمل زندگی گزارنے میں مدد فراہم کرتا ہے مگر جب ایک سماج میں اور بہت سے سماج مل ہو جائیں تو ایسے میں دیگر مسائل بھی جنم لے لیتے ہیں۔ کراچی کے میٹروپولیٹن ہونے کی وجہ سے کراچی میں ملک کے مختلف علاقوں سے افراد روزگار کی تلاش میں زندگی گزار رہے ہیں نہ صرف یہ بلکہ ہجرت کے نتیجے میں ہونے والی نقل مکانی میں بھی سب سے زیادہ لوگ ہجرت کر کے کراچی میں آکر آباد ہوئے اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے علیحدگی کے نتیجے میں ہونے والی نقل مکانی میں بھی ملک بدر ہونے والے افراد نے کراچی میں ہی آکر پناہ لی۔ ایسے میں کراچی میں مختلف سماج، علاقوں، زبانوں اور مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد آباد ہیں جہاں ان مختلف سماجوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے کراچی کو کثیر السماج معاشرہ بنا دیا ہے وہیں اس کراچی کو دیگر مسائل کا بھی سامنا ہے۔ ادیب اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے وہ اپنے سماج کا بغور جائزہ لیتا ہے اور اس میں رونما ہونے والے واقعات اور مسائل کو اپنی تحریر کا حصہ بناتا ہے۔ ان تحاریر میں افسانہ بھی شامل ہے۔ افسانہ ایسی تحریر کو کہتے ہیں جو ایک ہی نشست میں بیٹھ کر پڑھا جاسکے۔ اردو ادب میں افسانہ نگاری کا آغاز پریم چند سے ہوا اور یہ فن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آج بھی جاری و ساری ہے۔ اس فن میں ہمیں بہت سے ہنر مند اور مایہ ناز افسانہ نگار دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے ہیں انہیں میں ایک نام آصف فرخی کا بھی ہے۔ آصف فرخی جن کا اصل نام آصف اسلم ہے۔ کراچی کے علاقے ناظم آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ آپ کے والد اسلم فرخی کا تعلق ایک ادبی

گھرانے سے تھا جب کہ آپ کی والدہ ڈپٹی نذیر احمد کی پڑپوتی ہیں۔ اس طرح آصف فرخی کی تربیت ادبی ماحول میں ہوئی یہی وجہ تھی کہ بچپن ہی سے آپ کو اردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور طب کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اردو ادب سے آپ کی دلچسپی کم نہ ہوئی۔ اور بہت ہی کم عرصے میں اردو ادب میں اپنا نام پیدا کر لیا مگر بد قسمتی سے زندگی نے آپ کو زیادہ وقت نہ دیا اور دل کا دورہ پڑنے سے ۲ جون ۲۰۲۰ء کو وفات پا گئے۔ آپ کے افسانوں کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

آصف فرخی کا شمار افسانوی منظر نامے پر ان افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے جو کسی بھی عام واقعہ، منظر اور کہانی کو افسانہ بنانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ آصف فرخی کی فنکارانہ فکر، طرز احساس اور تخلیقی شعور ہمارے سامنے سماجی، تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی طور پر مزید واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ اردو افسانہ اپنے اندر بے شمار موضوعات اور جہتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ اور یہی خصوصیت آصف فرخی کے افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اگر آصف فرخی کی افسانہ نگاری کے فن اور ان کے افسانوی مجموعوں کے عنوانات پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے ہر افسانوی مجموعہ کا عنوان اپنے اندر گہرے معنی لیے ہوئے ہے۔ افسانوی مجموعے کے عنوان سے ہی ہمیں مجموعے میں موجود افسانوں کے موضوعات اور ان میں پوشیدہ معنی بخوبی سمجھ آ جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں موضوعات کی متنوع جہات ملتی ہیں۔ انہوں نے زندگی کو کسی ایک رخ یا نظریے سے نہیں دیکھا بلکہ زندگی کے ہر زاویے کو نہ صرف دیکھا بلکہ اسے جانچ اور پرکھ کر اپنے افسانوں میں جگہ بھی دی ہے۔ معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے ہر نئے منظر نامے، معاشرتی آویزش سے پیدا ہونے والی ہر رکاوٹ اور مشکل ان کے افسانوں میں جنم لیتی نظر آتی ہے۔ اسی طرح اگر آصف فرخی کے افسانوں کا فنی طور پر جائزہ لیا جائے تو ان کے افسانوں کی ترتیب اور واقعات کے اعتبار سے مختلف پلاٹ کی قسمیں نظر آتی ہیں۔ ان کے کچھ افسانے سیدھے سادے پلاٹ پر مبنی ہے کچھ پیچیدہ اور کچھ افسانے غیر پلاٹ پر مبنی ہیں۔ ان کے افسانے دفینہ، یادوں کے پردیس، چیل گاڑی، شیطانی چرخہ، مینا کی گنتی اور افسانوی مجموعے شہر ماجرہ اور شہر بیتی میں شامل بہت سے افسانے سادہ پلاٹ کے حامل ہیں ان میں ایک ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے اور ان افسانوں میں موجود کہانیوں کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان کی افسانوی مجموعے "چیزیں اور لوگ" میں شامل بہت سے افسانے جن میں "من شر ما خلق" اور "آتش فشاں پر کھلے گلاب" میں شامل ہیرے جیسی کہانی، آتش فشاں پر ناچنے والا چوہا، ناقتہ اللہ، بوڑھ کہانی اور ختم کہانی جبکہ افسانوی مجموعے "میرے دن گزر رہے ہیں" میں شامل افسانہ "کہر" پیچیدہ پلاٹ کے حامل افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

آصف فرخی کے ان افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر کس قدر حساس طبیعت رکھتے ہیں۔ ان کے بہت سے افسانوں میں میڈیکل آلات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ آپ اگر اتنے حساس اور باریک بین افسانہ نگار نہ ہوتے تو یقیناً ایک ماہر سرجن ہوتے۔ آپ کا شماران افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد کے آشوب کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ جدید دور کے انسان کے سماجی اور ذہنی رویوں اور مسائل کو اجاگر کیا اور نہ صرف یہ بلکہ اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی ماحول کو تاریخی و تہذیبی تسلسل کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا۔ فرد کے ظاہری اور باطنی خلا کو محسوس کیا، معاشرتی بے حسی پر روشنی ڈالی، کراچی کے ہلاکت آفریں ماحول، ڈری سہمی فضاؤں، انجان اندیشوں اور بے یقینی کی صورتحال کی سچی تصویر کھینچ کر اپنے افسانوں کے ذریعے ہمارے سامنے رکھ دی۔ آصف فرخی اپنے افسانوں میں بھیس بدل بدل کر کبھی ماضی میں جھانکتے نظر آتے ہیں تو کبھی حال کے منظر نامے پر غور کرتے دکھائی دیتے ہیں اور پھر زندگی کے ان تمام رنگوں اور مناظر کو یکجا کر کے اپنے افسانوں میں دکھاتے نظر آتے ہیں۔

اردو ادب میں افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی میں مغربی ادب کے زیر اثر ہوا۔ ایسے میں اردو افسانہ نگاری کی روایت کی بات کی جائے تو یہ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ "پریم چند" کو اردو کا پہلا افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ اردو افسانہ نگاری کا پہلا دور بھی ہے، اس دور میں ہمیں دو طرح کے تخلیقی رجحان دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک تخیلی ، دوسرا حقیقی۔ تخیلی رجحان کے تحت لکھنے والوں میں سجاد حیدر یلدرم، احمد نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، ل احمد وغیرہ جیسے افسانہ نگاروں کے نام اہم ہیں۔ جبکہ حقیقی رجحان کے تحت لکھنے والے افسانہ نگاروں میں "پریم چند" کا نام اہم ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی اور سماجی مسائل کو موضوع بنایا اور اپنے افسانوں کے ذریعے معاشرے کی تصویر کشی کی ہے۔

اردو افسانہ کے دوسرے دور میں بھی پہلے دور کی طرح تخیلی اور حقیقی رجحان دیکھنے کو ملے۔ بس فرق صرف اتنا سا آگیا کہ تخیلی رجحان نے اپنی صورت بدل لی اور تخیل کو زمینی مسائل اور سماجی کروٹوں کو پرکھنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا اس سلسلے میں "کرشن چندر" کا نام اہم اور نمایاں ہے۔ اردو افسانے کے دوسرے دور میں ایک نیا رجحان جو دیکھنے کو ملا وہ نفسیاتی مطالعے کا تھا۔ اس نے افسانے کو تسخیر محض کی فضا سے نکال کر اس سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہوئے زندگی اور معاشرے میں جاری ہلچل پر گہری نظر ڈالی۔ اردو افسانے کے دوسرے دور میں حقیقت پسندی کے علاوہ نفسیاتی مطالعے کی روش نے بھی فروغ پایا نیز اسی دور میں مزید تین طرح کے رجحان دیکھنے کو ملے جن میں ایک ارضی تخیلی، دوسرا حقیقت نگاری اور تیسرا نفسیاتی مطالعے کا تھا۔ نفسیاتی

مطالعے کا یہ رجحان پہلے دونوں رجحانات کے امتزاج سے وجود میں آیا اور یہ رجحان اس سے پہلے دور میں نہیں دیکھا گیا۔ اس رجحان کے تحت لکھنے والے افسانہ نگاروں نے انسانی زندگی اور اس کے مسائل کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کا گہرا مشاہدہ کیا۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اردو افسانے کے تیسرے دور کا آغاز ہو گیا مگر بدقسمتی سے برصغیر پاک و ہند کے رہنے والوں کو اس آزادی کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑی۔۔ آزادی کی اس ہنگامہ خیز صورتحال کے بعد بہت عرصے تک اردو افسانے میں آزادی کے نتیجے میں ہونے والے فسادات کو موضوع بنایا گیا۔ اس دور میں لکھنے والے افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب، حیات اللہ انصاری، رحمان مذنب، جیلانی بانو، قراۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی، صادق حسین، بلراج کومل، یونس جاوید اور ہاجرہ مسرور کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت کا مسئلہ بھی وابستہ تھا مگر فسادات کے مسئلے تلے یہ مسئلہ اس وقت وقتی طور پر دب گیا اور کچھ عرصے بعد ہجرت کے مسئلہ پر افسانے لکھے گئے۔ ہجرت کے موضوع پر سب سے زیادہ لکھنے والوں میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور احمد ندیم قاسمی کے نام نمایاں ہیں۔ ۸۰ء کی دہائی کو پاکستان کے لیے سیاسی ابتری کا زمانہ کہا گیا ہے اسے مزاحمتی ادب کی دہائی بھی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں جتنا بھی ادب تخلیق کیا گیا اس کا زیادہ تر موضوع مارشل لاء اور ظلم و جبر کے خلاف عوامی اظہار خیال تھا۔

پاکستان میں ۸۰ء اور ۹۰ء کی دہائی میں اردو افسانے نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی جس کے نتیجے میں ترقی پسند، سماجی حقیقت نگاری، اور تجریدی و علامتی افسانے سے ہٹ کر مختلف قسم کے افسانے لکھے جانے لگے۔ اردو افسانے میں اسی کی دہائی اپنے ساتھ خوف و دہشت، قتل و غارت، تنہائی، بے اعتمادی، داخلی اور خارجی ٹوٹ پھوٹ، شکست و ریخت اور وجود کے معدوم ہو جانے کے احساسات کی تند و تیز لہریں اپنے ساتھ لے کر آئی جنہیں نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان میں رہنے والے افسانہ نگاروں نے بھی شدت سے محسوس کیا اور اس احساس کی جڑیں معروضی حقائق، معاشرتی استبداد، انتشار، جبر و تشدد اور معاشرتی ناانصافیوں میں پیوست رہی ہیں۔ اس موضوع پر پاکستان اور ہندوستان میں بہت سی غیر معمولی کہانیاں لکھی گئیں۔ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی رجحانات جو انسانی زندگی پر اثرانداز ہوئے اس کا آغاز بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں سے ہو گیا تھا اس حقیقت کو تب تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک ان کا مطالعہ نہ کیا جائے اور کچھ ایسی ہی صورتحال ادب کے مطالعے کے ضمن میں بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

اس ساری صورتحال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ دور تھا جب دنیا بھر میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ایک نئی تازہ ترین تحقیق کے مطابق کراچی کو دنیا کا ساتواں بڑا شہر تصور کیا جارہا ہے سندھ کی تاریخ میں اسے ہمیشہ ایک بڑے تجارتی مرکز کی حیثیت سے منفرد مقام حاصل رہا ہے انگریزوں نے اس شہر کی تعمیر بالکل مختلف انداز میں کی تھی. فلپ ورڈرف نے اپنی کتاب "Men who rule India " میں کراچی کو پنجاب اور افغانستان تک پہنچنے کا دروازہ قرار دیا اور کلکتہ کے مقابلے میں کراچی کو انگریزوں کی قدرتی بندر گاہ کہا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کی کراچی کی معاشرتی و ثقافتی فضا شروع سے ہی اندرون سندھ کی معاشرتی و تہذیبی فضا سے مختلف رہی ہے۔ کراچی کی سمندری بندر گاہ اور محل وقوع نے نہ صرف صوبہ سندھ کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ پورے پاکستان کی اقتصادی سرگرمیوں میں کراچی کا ایک تہائی حصہ شامل ہے۔ ملک کی کل آبادی کا ایک بڑا حصہ یہاں آباد ہے اور یہاں سے روزی روٹی کمار ہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اس شہر کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے بہت سی سازشیں کی گئیں۔ سندھ سے کراچی کی علیحدگی اور پھر کراچی سے وفاقی دارالحکومت کو اسلام آباد منتقل ہونے سے کراچی کی ترقی پر منفی اثرات پڑے لیکن سب سے زیادہ کراچی کو نقصان وہاں کے لسانی گروہوں، دہشتگردوں اور مفسدوں نے پہنچایا جنہوں نے کراچی میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور ذاتی گروہی مفادات کی حصولیابی کی خاطر ایک طویل عرصے تک کراچی کو یرغمال بنائے رکھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اگر دیکھا جائے تو سندھ اور کراچی کو جس قدر یہاں آباد سندھیوں، مہاجروں اور پٹھانوں نے اپنے منفی کردار کے تحت جس قدر نقصان پہنچایا اس کی تلافی آئندہ کی نسلوں تک ممکن نہیں ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۲۰۰۰ء میں کراچی کی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی جس میں مہاجر یعنی اردو بولنے والے ۵۲ فیصد تھے جبکہ باقی آبادی پشتونوں، پنجابیوں، افغانیوں، میمنوں، مکرانیوں، بلوچوں، آزاد کشمیریوں اور فلسطینیوں پر مشتمل تھی۔ یہاں تک یہ برمی اور بنگالی بھی تقریباً دس لاکھ کے قریب یہاں آباد تھے جنہیں بنگلہ دیش کے بننے کے بعد غیر قانونی قرار دے کر ملک بدر کر دیا گیا تھا اور وہ کراچی میں آبسے۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی کو مخلوط آبادی کی وجہ سے چھوٹا پاکستان بھی کہا جاتا ہے اور اس غیر متوازن اختلاط نے بعض ایسے مسائل کو جنم دے دیا ہے جو پورے کراچی کیلئے مستقل عذاب کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ شہری سہولتیں آبادی کے مسلسل اور تیزی سے اضافے کے باعث کم یاب اور بعض علاقوں میں نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ آئے دن شہر میں واقع صنعتی، تجارتی اور کاروباری مراکز کو بعض

عناصر کی روز روز ہڑ تالوں، ہنگاموں، ایذا رسانیوں، اغوا، توڑ پھوڑ اور بھتہ خوروں اور قتل و غارت گری نے تباہ و برباد کر دیا ہے اور یہ کاروباری مراکز دوسرے صوبوں میں منتقل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

یہ تھا وہ تمام پس منظر جس کو سامنے رکھتے ہوئے آصف فرخی نے کراچی کے مسائل اور ان کے نتیجے میں فرد کی نفسیات کو اپنے افسانوں میں بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ کراچی نے قیام پاکستان کے بعد سے لے کر اب تک مختلف ادوار کو دیکھا ہے۔ آصف فرخی کے آباواجداد ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے لیکن آصف فرخی نے کراچی میں ہی اپنی آنکھ کھولی اور اس وقت سے لے کر اب تک کراچی کو مختلف نشیب و فراز سے گزرتے دیکھا اور بڑی گہرائی سے ان تمام حالات و واقعات کا مشاہدہ بھی کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ کراچی کے بدلتے حالات اور تبدیل ہوتے منظرنامے کو دیکھا ہے بلکہ ان تمام تبدیلیوں اورواقعات وحالات نے کراچی میں رہنے والے فرد کی نفسیات کو کس طرح متاثر کیا ہے اس کا بھی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اوراپنے اس مشاہدے کو اپنے افسانوں کا حصہ بنا دیا ہے۔ کراچی جو کہ ۱۹۸۰ء سے پہلے اپنی فضا میں ہر لمحے محبت اور خوشیوں کی خوشبو بکھیر رہا تھا اچانک اس شہر کو کسی کی نظر لگ گئی۔ دن رات روشنیوں میں جگمگاتا شہر اندھیروں میں ڈوبنے لگا۔ محبت اور خوشیوں سے بھرپور فضا خوف اور دہشت کی فضا میں تبدیل ہو گئی۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں شہر کے انہی مسائل کے نتیجے میں فرد کی الجھی ہوئی نفسیات کو بیان کیا ہے۔

افسانوی مجموعے "میرے دن گزر رہے ہیں" میں شامل افسانوں میں آصف فرخی اپنے شب و روز میں پیش آنے والے واقعات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیت کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے اس مجموعے میں شامل ایک افسانہ "پرندے کی فریاد" میں موجودہ دور کے فرد کی نفسیات اور اس کی ذہنی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح پنجرے میں قید پرندے کس غم اور خوف کا شکار ہوتے ہیں اسی خوف کے باعث وہ پنجرے کے ایک کونے میں سکڑے سہمے بیٹھے ہیں اور جب کوئی انجان ہاتھ انہیں اس پنجرے سے رہائی دلانے کے لئے لیے پنجرے کے اندر ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر انہیں باہر نکالتا ہے تو اسے ان کے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح اس شہر کراچی میں رہنے والا ہر فرد خود کو اس شہر میں قید سمجھتا ہے وہ روزانہ ایک لگی بندھی روٹین کے ساتھ مختلف علاقوں سے گزرتا ہوا پھر واپس وہیں لوٹ آتا ہے اس کے ارد گرد وں ان دیکھا پنجرہ ہے جو کسی کو نظر نہیں آتا۔ شہر کی اس ہنگامی اور مصروف زندگی نے فرد کو قید کر کے لاچار کر دیا ہے وہ چاہ کر بھی خود کو کو اس گھٹن زدہ ماحول اور قید سے آزاد نہیں کرواسکتا اور نہ ہی کوئی ہاتھ نظر آتا ہے جو اسے اس قید سے آزاد کرا دے اور کچھ نہیں تو اس پنجرے کو کشادہ ہی

کر دے مگر شاید یہ کسی کے اختیار کی بات نہیں ہے۔ کراچی کو پاکستان کا معاشی حب کہا جاتا ہے۔ قدرتی سمندری بندر گاہ ہونے کی وجہ سے یہ شہر بہترین تجارتی مقام کی حیثیت سے شہر کی شکل اختیار کر گیا۔ یہاں ملک بھر سے لوگ تلاش معاش کے لیے آتے ہیں۔ صنعتی و تجارتی شہر ہونے کے ناطے سے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پر یہاں کاروبار کے سلسلے میں بھی کاروباری حضرات آتے ہیں۔ مگر اسی کی دہائی سے شروع ہونے والے دہشت گردی کے واقعات اور فرقہ وارانہ ہنگاموں کے نتیجے میں ہونے والے قتل و غارت کے واقعات نے شہر کی معیشت کو بھی بہت نقصان پہنچایا۔ شہر میں ہونے والے ہنگاموں سے آئے دن ہونے والی ہڑتالوں سے تاجر طبقہ بری طرح متاثر ہوا۔ پر امن حالات جہاں افراد کو مکمل آزادی سے معاشرتی و سماجی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل بناتے ہیں وہی معاشی حوالے سے بھی فرد کو مستحکم ہونے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

آصف فرخی کے افسانوں میں فرد کی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہر موضوع کو اپنے افسانوں کے ذریعے اجاگر کیاہے۔ اسی طرح کراچی میں رہنے والے افراد کے معاشی مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ زندگی گزارنے کے لئے روزی، کپڑا اور مکان فرد کی بنیادی ضروریات ہیں اور ان میں روزی کمانا اہم ترین ضرورت ہے جس کے بل بوتے پر انسان کی باقی دونوں ضرورتیں بھی پوری ہوتی ہیں۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں کراچی میں ہونے والے ہنگاموں اور ان کی وجہ سے شہریوں کو درپیش مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے معاشی مسائل کو بیان کیاہے افسانہ "بلڈ بینک" میں شہر میں آئے روز برپا ہونے والے ہنگاموں کے نتیجے میں شہر کو بند کر دیا جاتا ہے ایسا لگتاہے کہ شہر سانس روکے کھڑا ہے۔ مذکورہ بالا کراچی کے افراد کے معاشی مسائل اس وقت کے ہیں جب اسی کی دہائی کے بعد شہر میں افغان مہاجروں کو پناہ دی گئی جس کے بعد شہر بھرنے سکھ کا سانس نہیں لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کراچی کے شہریوں نے پہلی دفعہ کلاشنکوف اور رائفل ایسے کھلے عام دیکھی تھی پھر اس کے بعد تو اس اسلحے کی وہ نمائش اور استعمال ہوا کراچی شہر میں کہ جس سے کراچی میں رہنے والا کوئی فرد محفوظ نہ رہ سکا۔ ملک دشمن قوتوں نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کراچی کی معیشت کو بری طرح نقصان پہنچایا۔ بہت سے کاروباری حضرات اپنے کارخانے، ملیں اور کاروبار لپیٹ کر دوسرے صوبوں اور شہروں میں لے گئے۔ یہ وہ وقت تھا جب کراچی میں رہنے والا خاص اور عام انسان معاشی حوالے سے خود کو انتہائی غیر محفوظ اور مستحکم محسوس کر رہا تھا ایک لمبے عرصے سے شروع اس ہنگامہ خیز صورتحال پر رینجرز کی مدد سے بالآخر قابو پا لیا گیا۔ اب کراچی دوبارہ سے اللہ کے رحم و کرم سے مکمل طور پر پر امن شہر بن چکا ہے نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی

سرمایہ کار بھی کراچی میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ جس سے کراچی میں رہنے والے افراد کو روز گار کے نت نئے مواقع فراہم ہو رہے ہیں۔ مگر جہاں سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے اور کراچی کی معیشت مستحکم ہو گئی ہے وہیں بہت سے افراد کچھ معاشی و تجارتی پالیسیوں سے بھی متاثر ہو رہے ہیں خاص طور پر نچلے طبقے کے مزدور پیشہ افراد بہت سے تجارتی منصوبوں کی وجہ سے اپنا روز گار کھو رہے ہیں۔ "میرے دن گزر رہے ہیں" افسانوی مجموعے میں شامل تمام کہانیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ تمام تر کہانیاں آصف فرخی کے کراچی میں گزرنے والے شب وروز کے حوالے سے ہیں گویا یہ کہانیاں نہیں بلکہ کراچی میں رہنے والے افراد کی آپ بیتیاں ہیں۔

افسانہ "شہر تہہ آب" میں شہر میں سیوریج اور پانی کی نکاسی کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کراچی جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے اور اگر کبھی آسمان پر کالے بادل منڈلانے لگے تو شہری خوش ہونے کے بجائے اس فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کہیں یہ بارش رحمت کی بجائے ان کے لئے زحمت ہی نہ بن جائے۔ یہ فکر کراچی میں رہنے والوں کے لیے کچھ غلط بھی نہیں ہے شہر بھر میں پانی کی نکاسی کا نظام مفلوج ہو چکا ہے۔ جگہ جگہ گٹر ابل رہے ہیں۔ شہر میں موجود نالے کوڑا کرکٹ کی وجہ سے اپنا کام کرنا تقریباً بند کر چکے ہیں جس کی وجہ سے شہر بھر کا پانی نالوں میں جانے کے بجائے گٹروں سے ابل ابل کر پورے شہر میں پھیل جاتا ہے۔ ایسے میں جب بارش ہوتی ہے تو نہ صرف بارش کا پانی بلکہ گٹروں کا گندا پانی بھی اس میں شامل ہو کر شہریوں کی گھروں میں داخل ہو جاتا ہے۔ شہر میں اراضی کی غیر منصوبہ تقسیم، تعمیرات اور تجاوزات کا سلسلہ زور پکڑتا جا رہا ہے ان غیر منصوبانہ اور غیر قانونی تعمیرات اور تجاوزات کی وجہ سے عوام کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے انتظامیہ اور عدلیہ کی جانب سے بعض اوقات ان کا نوٹس دیا جاتا ہے مگر اس پر عمل درآمد نہیں کروایا جاتا اور صوبائی حکومت کی مسلسل لاپرواہی کی وجہ سے شہریوں کی زندگی کو مسلسل امتحان بنا رکھ۔ اہے اسی کی کے بعد بھی شہر میں میں امن وامان کی صورتحال بگڑ گئی جس پر قابو پانے میں کئی دہائیاں بیت گئیں۔ ایسے میں صوبائی حکومت وفاقی حکومت اور شہر کی انتظامیہ ایک دوسرے پر محض کرنے کی وجہ سے کچھ نہ کر پائے شر پسند عناصر نے لوٹ مار اور قتل وغارت کے واقعات سے شہریوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا شہریوں کو تحفظ دینے والے شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے کی بجائے بے گناہ عام شہریوں کو رشوت کے ذریعے لوٹنا شروع کر دیا۔

حفاظتی ادارے عوام کی فلاح وبہبود کی بجائے عوام کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھانے میں مصروف نظر آئیں تو پھر اس شہر کا کیا حال، کیا مستقبل ہو گا۔ افسانہ سمندر کی بیماری، سمندر کی چوری، شہر تہہ آب اور مائی کولاچی جیسے

افسانوں میں بھی شہر کی روز بروز بڑھتے مسائل انتظامیہ اور سیاسی شخصیات کی غفلت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آصف فرخی اپنے افسانے "اسپائڈر مین" میں کراچی شہر کی اہم سیاسی رہنماؤں پر تنقیدی چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں کراچی شہر جو ملک کا سب سے بڑا شہر ہے نہ صرف یہ بلکہ ملک کو سب سے زیادہ سرمایہ دیتا ہے اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں، جب الیکشن کا موسم آتا ہے تو سیاسی شخصیات کراچی کی عوام کو اس قدر امید افروز خواب دکھاتے ہیں کہ عوام کو لگتا ہے کہ شاید یہی ہمارے خیر خواہ ہیں اور ہمارے شہر کو ڈوبنے سے بچائیں گے۔ مگر جب یہ سیاسی شخصیات عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آجاتی ہیں تو اس طرح عوام سے آنکھیں پھیرتے ہیں جیسے جانتے ہی نہ ہوں عوام اب بھی کسی سپائڈر مین کے انتظار میں ہے کہ کوئی آئے اور ان کے مسائل کو حل کر دے۔ اسی طرح کراچی سمندر میں تیل شامل ہونے کا یہ پہلا یا آخری واقعہ کو بھی آصف فرخی نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے شہر بھر کا سیوریج بغیر کسی فیلٹر کے کراچی سمندر میں شامل ہو رہا ہے اور اس پر مزید اب اس میں تیل شامل ہونے پر سمندر بری طرح متاثر ہو رہا ہے جو کہ سمندر میں رہنے والی آبی مخلوق کے لئے زہر قاتل ہے مگر اعلی افسران باقی تمام معاملات کی طرح اس معاملے کی طرف سے بھی غفلت برت رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ سینکڑوں مچھلیاں، بحری پرندے، کچھوے، کھڑے اور آبی پودے آہستہ آہستہ سمندری آلودگی کا شکار ہو کر مر رہے ہیں جس سے سمندر کا قدرتی حسن ختم ہوتا نظر آرہا ہے اور ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے پورے کا پورا شہر ہی کسی بیماری کی زد میں آگیا ہے۔ شہر کی صورتحال یہ ہے کہ پورے کا پورا شہر گندگی کا ڈھیر بن چکا ہے ہر گلی محلے کے کونے پر کچرا کنڈیاں بنادی گئی ہیں جبکہ سڑکوں کو کچرے کے ڈھیر اور ابلتے گٹروں سے مزین کر دیا گیا ہے جن سے پیدا ہونے والی بدبو ماحول کو تعفن زدہ کیے ہوئے ہے اب کسی علاقے کی شناخت کے لئے کسی مشہور عمارت یا بورڈ سے نہیں کی جاتی بلکہ سڑکوں کی حالت اور ان سڑکوں پر پھیلے کچرے سے علاقوں کی شناخت ہو جاتی ہے کہ یہ کونسا علاقہ ہے اس کچرے نے نہ صرف سڑکوں گلیوں پر قبضہ کر رکھا ہے بلکہ شہر کے بڑے بڑے بھی کچرے سے بھرے پڑے ہیں اور کچھ ان نالوں پر بنے کچی آبادی کے گھروں اور دکانوں نے کسر پوری کر دی ہے جس سے نالوں نے اپنا کام کرنا تقریباً چھوڑ دیا ہے نالوں کا کام شہر میں جمع ہونے والے اضافی پانی کو سمندر تک پہنچانا تھا مگر نالوں سے سمندر تک فلٹر ہوئے بغیر گندا پانی جس میں کوڑا کرکٹ بھی شامل ہوتا ہے سمندر میں شامل ہو رہا ہے جس سے سمندر میں موجود آبی مخلوق اور پودے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔

کراچی کی امن وامان کی صورتحال کوموضوع بناتے ہوئے آصف فرخی نےدو افسانوی مجموعے "شہر بیتی" اور "شہر ماجرا" تحریر کیے ان دونوں افسانوی مجموعوں میں آصف فرخی نے کراچی میں آئے دن ہونے والے دہشت گردی کے واقعات اور انکی وجہ سے شہر میں امن وامان کی بگڑتی صورتحال اور اس کے شہریوں کی زندگی پر پڑنے والے اثرات کو تفصیل اور باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ ان مجموعوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کراچی کو پچھ کچھ سالوں میں کس قدر درد اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس نے اپنے اندر کس قدر دکھ اور تکالیف سمیٹ رکھی ہیں۔

آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں کراچی میں رہنے والے فرد کے شب و روز کے ان حالات و واقعات کو کراچی کے امن وامان کے مسائل کے تناظر میں بیان کیا ہے جن سے متاثر ہو کر فرد کے معمولات زندگی متاثر ہو رہے ہیں۔ اپنے ایک افسانے "فریکچر" (شہر بیتی) میں آصف فرخی ایک ایسے فرد کے شب و روز پر روشنی ڈال رہے ہیں جو شہر میں آئے روز ہونے والے ہنگامی حالات کی وجہ سے یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ آیا اسے دفتر جانا چاہیے کہ نہیں۔ اگر وہ دفتر کے لیے گھر سے نکل پڑتا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ شہر میں حالات کی خرابی کی وجہ سے راستے بند ہو جائیں اور اسے پریشانی کا سامنا کرنا پڑے مزید یہ کہ اخبار سے بھی شہریوں کو شہر کے صحیح حالات کا اندازہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس میں بھی روزانہ ایک جیسی خبریں چھپتی ہیں جن سے شہر کے حقیقی حالات کا کچھ پتا نہیں چلایا جا سکتا۔ ان حالات میں شہریوں کا گھر سے باہر نکلنا کسی خطرے سے کم نہیں ایسے میں ٹیلی فون کے ذریعہ ہیں دوست احباب اور رشتہ داروں کی خیریت دریافت کی جاتی ہے اور ایک دوسرے سے اپنے اپنے علاقے کی خیر خبر لی جاتی ہے۔

ان افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ منزل کی حصولیابی کے لیے ہمیں مزاحم اور ارذل قوتوں کا سامنا ہے۔ ہمیں اب اپنے ہی ہم وطنوں اور ہم جنسوں کی سازشوں اور نفرت کے پھیلتے کڑوے کسیلے دھوئیں سے ہانپ ہانپ کر فرد کے اعصاب جواب دے چکے ہیں ان نامسائد حالات نے اسے اس قدر مجبور اور لاچار کر رکھا ہے کہ اسے فرار کی کوئی راہ نہیں ملتی موت ہر وقت اسے اپنے گرد منڈلاتی نظر آتی ہے۔ آصف فرخی کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح ایک مشین اپنے تمام پرزوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے قابل ہوتی ہے اسی طرح ایک سماج یا شہر بھی اپنی تمام اکائیوں کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ اگر سماج کی کوئی ایک اکائی بھی اپنا کام صحیح سے نہیں کرے گی تو سماجی ترقی بھی سست روی کا شکار ہو جائے گی۔

کراچی شہر جہاں مختلف سماجوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے اسے کثیر السماج شہر میں بدل کر اس کی رنگارنگی میں اضافہ کیا ہے۔ وہیں سماجی، لسانی اور فرقہ وارانہ اختلافات نے اسے عدم توازن کا بھی شکار بنادیا ہے۔ کراچی سے تعلق رکھنے والا فرد خود غرضی، ہوس پرستی اور شناخت کی گمشدگی جیسے سماجی مسائل کا شکار ہے۔ اس پر مزید تعصب پسندی اور فرقہ وارانہ سوچ نے کسر پوری کر دی ہے۔ اعلیٰ سیاسی قیادت اور شہری انتظامیہ بھی مفاد پرستی کا شکار ہے۔ شہر ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے بجائے تنزلی کی راہ پر گامزن ہے۔

کراچی کا سماج کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔ وہ شہر جو ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اس کو کوئی دیکھنے اور پوچھنے والا نہیں ہے۔ فرد اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات سے خوف، بے بسی اور نااُمیدی کا شکار ہو رہا ہے۔ شہر معاشی طور پر کمزور ہو رہا ہے سماج اپنی اعلیٰ اقدار کو بھلا رہا ہے۔

شہر کے سیاسی و انتظامی معاملات نا قابل بیان ہیں۔ شہر میں امن و امان کی صورتحال نے لوگوں کے لیے شہر میں زندگی بسر کرنا دوبھر کر دیا ہے۔ لوگ عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ شہر میں دن بدن بڑھتی ماحولیاتی آلودگی شہریوں کے لیے زہر قاتل بن رہی ہے اور قدرت کی طرف سے دیئے گئے بیش بہا قیمتی سمندر جیسی نعمت سے نہ صرف کراچی بلکہ پورا ملک ہاتھ دھونے کے درپر ہے مگر اس ساری صورتحال میں نہ صرف کراچی بلکہ ملکی ایوانوں میں سکون کا یہ عالم ہے کہ کسی کو اس شہر کی پرواہی نہیں ہے۔

کوئی اس شہر کی خبر لینے والا نہیں ہے۔ شہری آہ وپکار کر کر کے تھک چکے ہیں لیکن ایک امید ابھی بھی باقی ہے کہ شاید ایک دن کوئی نیک صفت انسان آئے گا اور ان کی اور ان کے شہر کی حالت کو بدل دے گا۔

المختصر یہ کہ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں کراچی شہر اور اس میں رہنے والے افراد کو درپیش جن انفرادی و اجتمائی مسائل کو بیان کیا ہے وہ حرف بہ حرف حقیقت پر مبنی ہیں۔ مصنف نے کسی لگی لپٹی کے بغیر ان تمام مسائل کو بیان کیا ہے جو کہ قابل تعریف ہے۔ اسے ہم اپنی خوش قسمتی کہیں تو غلط نہ ہو گا کی کراچی کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ ایسے نہیں ہیں جن کا حل کسی صورت ممکن نہ ہو بلکہ ان مسائل کا حل ہمارے سامنے موجود ہے بس ضرورت اس امر کی ہے کہ کراچی کو مخلص انتظامیہ و حکومت کی ضرورت ہے جو اس شہر سے محبت رکھتے ہوں اور اسکی ترقی و خوشحالی کی طرف اسی طرح توجہ کریں جس طرح اپنی ذاتی زندگی کو سنوارنے کے لیے اس پر توجہ دی جاتی ہے۔ وفاقی حکومت کو چاہیے کہ شہر کے لیے تیار کیے گئے سٹی پلان پر شہر کی انتظامیہ سے عملدرآمد کروائے، شہر کے بلدیاتی نظام کو بہتر کرنے کے لیے عملی اقدام کیے جائیں۔ شہر کے

ماحول کو بہتر بنانے کے لیے حکومتی اور عوامی سطح پر عملی اقدامات کیے جائیں۔اور آخر میں یہ کہ اپنے ملک اور شہر کو شر پسند عناصر کا نشانہ بننے سے بچانے کے لیے فرقہ وارانہ اور تعصب زدہ سوچ کو ختم کرنا ناگزیر ہے ورنہ ایسے ہی ملک دشمن قوتیں ہمیں آپس میں لڑوا کر ہماری جڑوں کو کھوکھلا کرتی رہیں گی اور اس سوچ کا خاتمہ اللہ کی رسی کو مضبوتی سے پکڑنے، ایک پرچم تلے متحد ہونے اور انسانیت کے رشتے کو پروان چڑھانے سے ہی ممکن ہے۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے قاری پر سوچ کے کئی نئے در وا کیے ہیں۔اور یہ بہترین لکھاری ہونے کی نشانی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے کے بعد میری توجہ اپنے ملک کے بڑے اور اہم شہر ااور اس کے مسائل کی جانب مبذول ہوئی۔مجھے یقین ہے کہ اس طرح کے افسانہ باقی افسانہ نگاروں کے لیے بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہونگے اور یہ اردو ادب کے لیے ایک نیا اضافہ ہو گا۔

تحقیقی نتائج:

اس تحقیق سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ میٹرپولیٹن شہر کراچی کے مسائل کو آصف فرخی کے افسانوں کے تناظر میں تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ شہر کو درپیش ان مسائل نے فرد کو بے بسی، بے یقینی، خوف اور مایوسی جیسی کیفیات کا شکار بنا دیا ہے۔

۲۔ کراچی کو درپیش اجتماعی مسائل کی بڑی وجہ انتظامیہ اور سیاست دانوں کی غفلت ہے۔

۳۔ آصف فرخی کے افسانوں کا تجزیہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر کراچی کے مسائل کو فوری حل نہ کیا گیا تو کراچی شہر کے ساتھ ملک کو بھی بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔جو شہر ملک کو پچھتر فیصد سالانہ ریونیو دیتا ہے اگر اسی کے سماجی و معاشی حالات مستحکم نہیں ہونگے تو وہ ملک کی معیشت میں اپنا کردار کس طرح ادا کر پائے گا۔

۴۔ ادب معاشرے کا عکس ہے جبکہ ادیب وہ شخصیت ہے جو اپنی تحریروں میں معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ آصف فرخی کے افسانوں کا کراچی کے مسائل کے حوالے سے تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ادیب جہاں اپنی تحریروں میں معاشرے میں موجود مسائل اور حالات کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے وہیں ادیب پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ ادب کے ذریعے معاشرے میں موجود انسانوں کی آپسی دوریوں، نفرت، بدعنوانی، ناانصافی، ظلم و جبر اور اپنے ماحول کو بہتر بنانے میں جس قدر کردار ادا کر سکتے ہیں کریں کیونکہ ادب کا کام صرف معاشرے میں موجود

مسائل کی نشاندہی کرنا نہیں ہونا چاہیے بلکہ قاری کو ان مسائل کے حل کی طرف کوشاں کرنا بھی ہونا چاہیے تا کہ معاشرہ عملی تبدیلی کی طرف گامزن ہو سکے۔

سفارشات:

اس تحقیق کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش ہیں:

۱۔ آصف فرخی موجودہ دور کے بہترین اور ذہین لکھاری ہیں۔ آپ کے افسانوں میں موضوعات کی متنوع جہات ملتی ہیں اور آپ کے افسانوں پر موجود تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ جبکہ آصف فرخی کے افسانوں پر مزید تحقیقی اور تجزیاتی کام کیا جانا چاہیے جو کہ اردو ادب میں ایک بہترین اضافہ ہو گا۔

۲۔ آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کے آشوب کو بیان کیا ہے اس حوالے سے آصف فرخی کے افسانوں کا کسی دوسرے افسانہ نگار کے افسانوں سے تقابل کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذات:

آصف فرخی، آتش فشاں پر کھلے گلاب، طارق پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۲ء

آصف فرخی، اسمِ اعظم کی تلاش، احسن مطبوعات، کراچی، ۱۹۸۴ء

آصف فرخی، چیزیں اور لوگ، احسن مطبوعات، کراچی، ۱۹۹۱ء

آصف فرخی، شہر بیتی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء

آصف فرخی، شہر ماجرا، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء

آصف فرخی، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا، فضلی پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۷ء

آصف فرخی، ایک آدمی کی کمی، فضلی پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۹ء

آصف فرخی، میرے دن گزر رہے ہیں، شہر زاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء

ثانوی ماخذات:

انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ: تحقیق و تنقید، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۰ء

اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، ادب اور انقلاب، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۹ء

اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، اردو افسانے کے معمار، نوبل پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء

اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو، افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، ماڈرن پبلی کیشنز ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء

اقبال آفاقی، ڈاکٹر، اردو افسانہ، فن ہنر اور متنی تجزیے، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء

انوار احمد، ڈاکٹر، ایک صدی کا قصہ (اردو افسانہ)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

انیس ناگی، نئے افسانے کی کہانی، جمالیات، لاہور، ۲۰۰۸ء

اے۔بی۔ اشرف، ڈاکٹر، کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

آغا سہیل، ڈاکٹر، ادب اور عصری حسیت، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۱ء

جمیل اختر محبی، ڈاکٹر، فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۲ء

رخسانہ پروین، آصف فرخی کی کہانی، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۹ء

سید وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء
شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
صبا اکرام، جدید افسانہ؛ چند صورتیں، فکشن گروپ آف پاکستان، کراچی، ۲۰۰۱ء
عرفان جاوید، مقدمہ سمندر کی چوری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء
مظہر جمیل، سید، آشوبِ سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۲ء
وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

Arif Hassan, Understanding Karachi, City press, Karachi, 1999

Laurent Gayer, Karachi, Oxford university press, New York, 2014

رسائل وجرائد

اجمل کمال (مرتب)، کراچی کی کہانی ۱، آج، کراچی، ۱۹۹۶ء
اجمل کمال (مرتب)، کراچی کی کہانی ۲، آج، کراچی، ۱۹۹۶ء
مکالمہ (سہ ماہی)، شمارہ: ۱۶، کراچی، جولائی ۲۰۰۶ء
مکالمہ (سہ ماہی)، شمارہ: ۱۷، کراچی، جنوری ۲۰۰۸ء

ویب گاہیں

پیرزادہ سلیمان، Asif farrukhi https://www.dawnnews.com ، ۱۱:۳۰ پی ایم، ۲۰ اگست ۲۰۲۱ء
ریاض سہیل، آصف فرخی، https//:www.bbc urdu.com، ۸:۳۰ پی ایم، ۲۰ اگست ۲۰۲۱ء